Parvez, Ghulam Ahmad

"

Nazr-i aqidat

نذرِ عقیدت

بحضور رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم

(بتقریب سعید عید میلاد النبیؐ)

پرویز

=/12 Paisa

Parvez, Ghulam Ahmad

Nazr-i 'aqidat

نذرِ عقیدت

بحضور رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم

(بتقریبِ سعید عیدِ میلاد النبیؐ)

پرویز

M.

=/13 Paisa

خدائے جلیل نے اپنے بندوں سے جو کچھ
کہنا تھا آخری مرتبہ کہہ دیا۔ شرفِ انسانیت کی تکمیل کے
لئے جو قوانین دیئے جانے تھے وہ اپنی انتہائی شکل میں دیدیئے
گئے۔ اس کے بعد انسان کو اپنی منزلِ مقصود تک پہنچنے کے لئے
کسی دوسری مشعلِ راہ کی ضرورت اور کسی اور ہادیٔ طریقت کی احتیاج
نہ رہی۔

اب

انسانیت کے مقام بلند تک پہنچنے کے لئے وہی ایک صراطِ مستقیم ہے جس پر
اس ذات اقدس و اعظم (ص) کے نقوش قدم جگمگ جگمگ کر رہے ہیں اور
جس کو دیکھ کر ہر خبیر و بصیر پکار اٹھتا ہے

مقامِ خویش اگر خواہی دریں دیر
بحق دل بند و راہ مصطفےٰ رو

پرویز
(معراج انسانیت صفحہ ۱۷۵)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

وہ آئے بزم میں.......

(۱)

شجر زندگی کی ہر شاخ سے نمی خشک ہو چکی تھی۔ تہذیب و تمدن کے پھول وحشت و بربریت کی بادِ سموم مرجھا چکے تھے۔ حسنِ عمل کے زندگی بخش چشمے یکسر خشک ہو چکے تھے۔ زمین پر جو ہرا انسانیت کی سرسبزی و شادابی یں نشان تک باقی نہ تھا۔ کثرتِ مذاہب و اخلاق کے حدود تو باقی تھے لیکن فصلیں بالکل اجڑ چکی تھیں۔ اس ت و سراسیمگی کے عالم میں خاسر و نامراد انسان اِدھر اُدھر مارا مارا پھر رہا تھا، لیکن خدا کی اس وسیع زمین سے کہیں زندگی کا نشان اور تازگی کا سراغ نہیں ملتا تھا۔ چاروں طرف سے مایوس و ناامید ہو کر اس کی نگاہیں ہو کر آسمان کی طرف اٹھتی تھیں اور ایک پکار سننے والے کو پکار پکار کر کہتی تھیں کہ مَتیٰ نَصْرُ اللہِ! یہ وقت تھا رت کے اٹل قانون نے اس افسردگی و پژمردگی کو پھر سے تازگی و شگفتگی میں بدل دیا۔

اس ربِ ذوالمنن کا سحابِ کرم، زندہ امیدوں اور تابندہ آرزوؤں کی ہزاروں جنتیں اپنے آغوش میں ربیع الاوّل کے مقدس مہینے میں فاران کی چوٹیوں پر جھوم کر آیا اور بلدِ امین کی مبارک وادیوں میں کھل کھلا کر ا۔ انسانیت کی مرجھائی ہوئی کھیتیاں لہلہا اٹھیں۔ اخلاق و تمدن کے پژمردہ پھولوں پر پھر سے بہار آ گئی۔ عمرانیت کے سبزۂ پامال میں نزہت و لطافت پیدا ہو گئی۔ اعمالِ صالحہ کے خشک چشمے، حیاتِ تازہ کی جوئے رواں ں تبدیل ہو گئے۔ طغیانی و سرکشی کی بادِ سموم، عدل و احسان کی جاں بخش نسیمِ سحری میں بدل گئی۔ فضائے سرتوں کے نغموں سے گونج اٹھی۔ انسان کو نئی زندگی اور زندگی کو نئے ولولے عطا ہوئے۔ آسمان نے جھک کر ں کو مبارکباد دی کہ تیرے بختِ بلند نے یاوری کی اور تیرے خوش نصیب ذرّوں کو اس ذاتِ اقدس دائم بوسی کی سعادت نصیب ہو گئی جو عالمِ موجودات کے سلسلۂ ارتقا کی آخری کڑی ہے۔ جس سے شرف و مجدِ انسانیت کی

تکمیل ہوگئی - جو علم وبصیرت کے اس افقِ اعلیٰ پر جلوہ بار ہے جہاں عقل وعشق، ناسوت ولاہوت، یہ اور وہ قوسین کی طرح آپس میں سمٹے ہیں - جو دانشِ روحانی اور حکمتِ برہانی کے اس مقامِ بلند پر فائز ہے جہاں غیب وشہود کی وادیاں دامنِ نگاہ میں سمٹ کر آجاتی ہیں - تو ہمیں فطرت نے "جنت سے نکالے ہوئے ابنِ آدم" کے اس طالعِ بیدار کا تقدیس وتحمید کے زمزموں سے استقبال کیا - دنیا سے طاغوتی قوتوں کے تخت اُلٹ گئے کہ وہ آنے والا آگیا جس کی آمد ملوکیت وقیصریت کے لئے پیغامِ فنا تھی - ایران کے آتش کدوں کی آگ ٹھنڈی پڑ گئی کہ اب انسانی تصورات کی دنیا نار کی جگہ نور سے معمور ہوگئی - دنیا کے صنم کدوں کے بت ... پاش پاش ہوگئے کہ آج مسلکِ ابراہیمیؑ کی تکمیل کا دن آگیا - شیاطین نے پہاڑوں میں جاکر منہ چھپا لیا کہ اب جور واستبداد کی ہر طاغوتی قوت کے روپوش ہونے کا وقت آگیا - دنیا سے باطل کی تاریکیاں دُور ہوگئیں کہ آج اس آفتابِ عالمتاب کا طلوع ہوا جس کے بھیجنے والے نے اسے جگمگاتا چراغ کہہ کر پکارا ـــــ اِنَّآ ارسلنٰك شاھدًا وّمبشرا ونذیرًا وّ داعیًا اِلَی اللّٰہِ باذنہٖ وسراجا منیرا - وہ آنے والا جس کی آمد کا مقصد یہ بتایا گیا تھا کہ ویضع عنھم اصرھم والاغلٰل التی کانت علیھم - جب وہ آیا تو اس نے ان تمام اغلال وسلاسل کو ایک ایک کرکے توڑ دیا جن میں انسانیت جکڑی ہوئی چلی آرہی تھی - احبار ورہبان کی برہمنیت کے طوق وسلاسل، قیصر وکسریٰ کی زنجیریں، توہم پرستی کی بصیرت سوز بندشیں، تقسیمِ انسانیت کے انسانیت کش نسلی، جغرافیائی، وطنی، غیر فطری معیار، سب ایک ایک کرکے ٹوٹتے چلے گئے اور پابندِ قفس، طائرِ لاہوتی کو پھر سے آزادی کی فضائے بسیط میں، اذنِ بال کشائی عطا ہوا - اور انسان ایک بار پھر زمین پر سر اونچا کرکے چلنے کے قابل ہوگیا - انسانیت کو اپنی منزلِ مقصود تک پہنچنے کی سیدھی راہ مل گئی - عقل کو عشق کا جنون اور عشق کو عقل کی فرزانگی عطا ہوئی - فقر کو شکوہِ خسروی اور پادشاہی کو استغنائے قلندری عنایت ہوا - یہ تھی وہ ذاتؐ گرامی کہ

محبت از نگاہش پائدار است
سلوکش عشق ومستی را عیار است
مقامش عبدہٗ آمد ولیکن
جہانِ شوق را پروردگار است

اِنَّ ذٰالِكَ لَمُحْیِ الْمَوْتٰی (۳۰)

اس طرح وہ دلوں کی مردہ بستیوں میں پھر سے زندگی کا سامان پیدا کر دیتا ہے۔

(معراجِ انسانیت - صفحہ ۱۷۱ - ۱۷۲)

(۲) اے سوارِ اشہبِ دوراں بیا

جب مشیتِ ایزدی کی تدبیرِ محکم، جس کے لئے زمین و آسمان یوں قرنہا قرن سے سرگرداں پھر رہے تھے، اپنی پختگی تک پہنچی۔ جب انسانیت، جس کے لئے کائنات نے ایک ایک ذرّے کو لاکھوں چکر دیئے تھے، گہوارۂ طفولیت سے حریمِ شباب میں آگئی۔ جب اس صحیفۂ فطرت کی تکمیل کا وقت آگیا جس کے مختلف اوراق ستاروں کی ٹھنڈی ٹھنڈی مرمریں روشنی میں کوثر و تسنیم سے دھلے ہوئے قلم سے لکھے گئے تھے۔ جب سینۂ کائنات میں اتنی کشادگی پیدا ہوگئی کہ وہ اپنے اندر رازہائے درونِ پردہ کے معدنِ لعل و گہر کو سمولے، تو آسمان کی حوریں زمین پر اتریں کہ جنت کے تر و تازہ پھولوں سے وادیٔ بطحا کی تزئین و آرائش کر دیں۔ صحنِ گلستانِ کائنات پر بہار آگئی۔ ہر طرف سے مسرتوں کے چشمے ابلنے لگے۔ چاند مسکرایا ستارے ہنسے۔ آسمان سے نور کی بارش ہوئی۔ فرشتوں کی معصوم نگاہوں میں "اِنِّیْٓ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ" کی تفسیر، ایک پیکرِ محبوبیت کا حسین تصور بن کر چمکنے لگی۔ فلک تعظیم کے لئے جھکا۔ زمین نے اپنی خاک آلود پیشانی سجدہ سے اٹھائی کہ آج اس کی قرنہا قرن کی دعاؤں کی قبولیت کا وقت آپہنچا تھا۔ صحرائے حجاز کے ذرّے جگمگا اٹھے۔ بلدِ امین کی گلیوں کا نصیبہ جاگا کہ آج اس آنے والے کی آمد آمد تھی جس کی طرف جبلِ تین پر حضرت نوحؑ نے اشارا کیا تھا اور جسے کوہِ زیتون پر حضرت مسیحؑ نے اپنے حواریوں کو وجۂ تسکینِ خاطر بنایا تھا۔ جس کی آمد کی بشارتیں وادیٔ طورِ سینین میں بنی اسرائیل کو دی گئی تھیں۔ اور جس کے لئے دشتِ عرب میں حضرت خلیلِ اکبرؑ اور ذبیحِ اعظمؑ نے اپنے خدا کے حضور دامن پھیلایا تھا وہ آنے والا، کہ جس کے انتظار میں زمانے نے لاکھوں کروٹیں بدلی تھیں آیا، اور اس شانِ زیبائی و رعنائی سے آیا کہ زمین و آسمان میں تہنیت کے غلغلے بلند ہوئے۔ فرشتوں نے زمزمۂ تبریک گایا۔ سدرۃ المنتہیٰ کی حدود فراموش شاخوں نے جھولا جھلایا۔ ملاءِ اعلیٰ کی مقدس قندیلوں نے چراغاں کیا۔ کائنات کے ذرّے چمک اٹھے۔ فضائے عالم درود و صلوٰۃ کی فردوس گوش صداؤں سے گونج اٹھی اور انس و جان وجد و کیف کے عالم میں پکار اٹھے کہ

اے سوارِ اشہبِ دوراں بیا	اے فروغِ دیدۂ امکاں بیا
در جہانِ ذکر و فکرِ انس و جاں	تو صلوٰۃِ صبح، تو بانگِ اذاں

(معراجِ انسانیت۔ صفحہ ۱۷۳-۱۷۴)

(۳) مقامِ محمدیؐ

یہ آنے والا رسول کافۃ للناس اور رحمۃ للعالمینؐ بن کر آیا اور اپنے ساتھ وہ نظام عدل وحریت لایا جو انسان کو دنیا بھر کی غلامی سے آزادی دلانے کا کفیل تھا۔ یہ پیغام کوئی انوکھا پیغام اور یہ تعلیم کوئی نئی تعلیم نہ تھی تمام جہاں کہیں بھی تھی اسی کتاب مبین کا کوئی نہ کوئی ورق تھی جو حضورؐ کی وساطت سے دنیا کو ملی۔ روشنی جس مقام میں بھی تھی وہ اسی قندیل آسمانی کی کوئی نہ کوئی کرن تھی جو قلب محمدیؐ میں اتاری گئی۔ مشامِ جان نے جہاں کہیں بھی عطر بیزی وعنبر فشانی کی وہ لالہ و یاسمن کی انہی پتیوں کی رہین منت تھی جن کا گلدستہ اس نبی آخر الزماںؐ کے مقدس ہاتھوں محرابِ کعبہ میں رکھا گیا۔

پیغامِ محمدیؐ کیا ہے؟ انہی اوراق کی شیرازہ بندی جنہیں حوادثِ ارضی وسماوی کی آندھی کے تیز جھونکوں نے صحنِ کائنات میں ادھر ادھر بکھیر دیا تھا۔ اور

مقامِ محمدیؐ کیا ہے؟

انہی درخشندہ وتابندہ ذراتِ نادرہ کا پیکرِ حسن وزیبائی کہ جن کی حقیقی آب وتاب کو ان کے ستائش گروں کی فرطِ عقیدت کی رنگینیوں نے مستور کر رکھا تھا۔ وہاں یہ جوہر الگ الگ پڑے تھے، اور یہاں یہ پیکرِ جلال وجمال ان سب کا حسین مجموعہ تھا۔ وہاں یہ الفاظ بکھرے ہوئے تھے اور یہاں یہ ایک ایسے عدیم النظیر مصرعہ میں آب وتاب سے موزوں ہو گئے تھے جو ضمیر کائنات میں قرنہا قرن سے پہلو بدل رہا تھا۔ وہ موتی تھے، یہ مالا تھی۔ وہ پتیاں تھیں، یہ پھول تھا۔ وہ ذرے تھے، یہ چٹان تھی۔ وہ قطرے تھے، یہ سمندر تھا۔ وہ ستارے تھے، یہ کہکشاں تھی۔ وہ افراد تھے، یہ ملت تھی۔ وہ نقطے تھے، یہ خط مستقیم تھا۔ وہ ابتدا تھی، یہ انتہا تھا۔

خلق وتقدیر وہدایت ابتداست
رحمۃ للعالمینی انتہاست

خدائے جلیل نے اپنے بندوں سے جو کچھ کہنا تھا آخری مرتبہ کہہ دیا۔ شرفِ انسانیت کی تکمیل کے لئے جو قوانین دیئے جانے تھے وہ اپنی انتہائی شکل میں دیدیئے گئے۔ اس کے بعد انسان کو اپنی منزلِ مقصود تک پہنچنے کے لئے کسی دوسری مشعلِ راہ کی ضرورت اور کسی اور ہادیِ طریقت کی احتیاج نہ رہی۔ اب انسانیت کے مقام بلند تک پہنچنے کے لئے وہی ایک صراطِ مستقیم ہے جس پر اس ذاتِ اقدس واعظم[۲] کے نقوشِ قدم جگمگ جگمگ کر رہے ہیں

اور جنہیں دیکھ کر ہر خبیر و بصیر پکار اٹھتا ہے کہ

مقامِ خویش اگر خواہی دریں دیر
بحق دل بند و راہ مصطفیٰؐ رو

(معراج انسانیت صفحہ ۱۷۵)

(۴) وَوَجَدَكَ ضَالًّا فَهَدٰى

طلبم نہایتے آں کہ نہایتے نہ دارد
بہ نگاہ ناشکیبے بہ دل امید وارے

قلبِ وادیٔ فاران، یعنی ام القریٰ مکہ، اپنی تمام نگاہ فریب جاذبیتوں کے ساتھ ہر مالوف و بادی کے لئے مرکزِ قلب و نظر بنا ہوا ہے۔ چونکہ ریگ زارِ حجاز کے ہر ذرّہ کی عقیدت حریمِ کعبہ کے ساتھ وابستہ ہے، اس لئے طفلک مے برتاد پیر نزد دو، کارواں در کارواں اپنی پیشانیوں میں تڑپتے ہوئے سجدوں کے نذرانے لئے، رواں دواں اور کشاں کشاں اس مرجعِ انام کی طرف چلے آرہے ہیں۔ جبینِ شوق سجدوں سے معمور ہے لیکن کچھ معلوم نہیں کہ مسجود کیا ہے؟ قلبِ نیاز جذبہ ہائے تعبد سے لبریز ہے لیکن کوئی نہیں جانتا کہ معبود کون ہے؟ زندگی کی تگ و تاز بہر نوع ہنگامہ خیز ہے لیکن کسی کو معلوم نہیں کہ اس تگ و تاز سے مقصود کیا ہے؟ کاروانِ حیات تیز گام ہے لیکن کوئی نہیں جانتا کہ اس کی منزل کونسی ہے؟ لیکن اس نہ جاننے کے باوجود ایک ہنگامہ ہے کہ ہر وقت برپا ہے جس میں ہر شخص اپنے آپ کو جذب کئے ہوئے ہے۔ اس کیف و مستی کے عالم میں کوئی تالیاں پیٹتا ہے، کوئی سیٹیاں بجاتا ہے۔ کوئی کعبہ کے گرد گھوم گھوم کر سفر ختم ہونے کے باوجود ذوقِ سفر کا مظاہرہ کر رہا ہے۔ کوئی بتوں کے آستانوں پر جانور ذبح کر کے انکا گرم گرم لہو پی رہا ہے۔ کوئی زمزم کے کنارے بیٹھا جام و سبو کے امتیازات مٹا رہا ہے۔ کاہنوں کے گرد عورتوں کا ہجوم ہے جو صبر گریز پا اور رنج گراں نشیں کے جگر سوز انسانوں کا مستقبل معلوم کرنا چاہتی ہیں۔ ادھر عکاظ کے بازار میں شعرائے جادو بیاں اپنی سحر آفرینیوں سے ہر سننے والے کے دل کو اپنی مٹھی میں لئے ہوئے ہیں۔ کبھی کسی کے خاندانی مفاخر کے تذکرے سے اس کے طرۂ استکبار میں اور بالیدگی پیدا کرتے ہیں اور گاہ کسی کے عزیز کے قتل کی یاد تازہ کر کے اس کی رگوں میں آتشِ انتقام کے شعلے اس طرح بھڑکاتے ہیں کہ بزمِ شعر خوانی آن کی آن میں رزم گاہ بن جاتی ہے۔ لیکن محفلِ عیش و طرب ہے یا میدان

جنگ و جدل ہر شخص پورے جذب و انہماک سے اس میں حصہ لیتا ہے اور اس ہمہ اور طنطنہ میں دنیا و مافیہا سے بے خبر، یوں مستغرق ہوتا ہے کہ کوئی کشش اسے اس ہنگامے سے باہر نہیں لے جا سکتی۔ چھوٹا بڑا، امیر غریب مرد، عورت سب ان ہنگاموں میں اس طرح شریک ہیں گویا یہ چیزیں ان کی معاشرت کا جزو اور ان کی قومی زندگی کا حصہ بن چکی ہیں۔

ایک استثناء لیکن مکہ کی ان پر ہجوم گلیوں میں ایک شخص ایسا بھی دکھائی دیتا ہے جو ان میں سے ہوتے ہوئے بھی ان میں کا معلوم نہیں ہوتا۔ اس کی طرز معاشرت، وضع قطع، تراش خراش سب انہی جیسی ہے۔ وہ انہی بازاروں میں پھرتا ہے۔ انہی لوگوں کے سے کاروبار کرتا ہے۔ ان کی شادی اور غم میں شریک ہوتا ہے۔ اس کے بیوی بچے ہیں جن کی پرورش بطریق احسن کرتا ہے۔ وہ اپنے آپ کو انہی جیسا انسان سمجھتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود وہ اپنی زندگی میں کچھ خلا سا محسوس کرتا ہے۔ اور نہیں جانتا کہ وہ خلا کیا ہے اور کس طرح پُر ہو سکتا ہے۔ وہ مشاغل و مشارب، جو اس کی قوم کا جزو زندگی بن چکے ہیں، اس کے لئے کوئی جاذبیت نہیں رکھتے۔ وہ بھی اپنی جبین نیاز میں ذوقِ عبودیت کے سجود رقصاں لے کر حرم تک جاتا ہے لیکن وہ ان گہرہائے تابندہ کو اسی طرح واپس لے آتا ہے کہ اسے وہاں انسانوں کی بنائی ہوئی کوئی چوکھٹ اس متاع گراں مایہ کے شایانِ شان دکھائی نہیں دیتی۔ جب وہ انسانوں کی گردنوں کو ان کی اپنی بنائی ہوئی مٹی اور پتھر کی مورتیوں کے سامنے جھکا ہوا دیکھتا ہے، تو محوِ حیرت رہ جاتا ہے کہ ـــــ یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے ؟ وہ مکہ کے بازار میں جب سرداران قریش کو اپنی عالی نسبی پر فخر کرتے دیکھتا ہے تو ہر چند وہ خود قریش کے ممتاز ترین گھرانے کا فرد ہے لیکن اس کا دل گواہی نہیں دیتا کہ جس چیز میں انسان کے اپنے اعمال کو کوئی دخل نہ ہو وہ باعث فخر و تکبر بھی ہو سکتی ہے۔ وہ بزم مے پرستی کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھتا کہ اس سے اس کی فطرت سلیم ابا کرتی ہے۔ وہ قمار خانوں کی طرف قدم نہیں اٹھاتا کہ وہاں اسے مہذب انسانوں کے بھیس میں رہزن دکھائی دیتے ہیں۔

تلاش حقیقت وہ جب ان محافل و مجالس میں اپنے لئے کوئی تسکین نہیں پاتا تو عیسائی رہبان اور یہودی احبار کی طرف رجوع کرتا ہے کہ اس نے سن رکھا ہے کہ وہ زندگی کے حقائق کا علم رکھنے کے مدعی ہیں۔ وہ خود لکھنا پڑھنا نہیں جانتا اس لئے ان علماء و مشائخ سے پوچھتا ہے کہ ان کے پاس کونسی روشنی ہے جسے وہ آسمانی کہہ کر پکارتے ہیں لیکن اسے ان مزعومہ آسمانی شمعوں پر انسانی ساخت کے ایسے ایسے فانوس نظر آتے ہیں جنہوں نے شمع کی اصل روشنی کو بالکل ڈھانپ رکھا ہے۔ وہ یہاں سے بھی

ٹھنڈی آہ بھر کر اُٹھ آتا ہے۔ اسے معلوم ہوتا ہے کہ انہی بستیوں میں کچھ لوگ ایسے ہیں جو اس کی طرح ان معبودانِ باطل سے متنفر ہیں۔ وہ ان کی طرف رخ کرتا ہے کہ شاید وہیں وہ سکون مل جائے جس کی اُسے تلاش ہے۔ لیکن اسے ان کا ذوق تشنہ اور تڑپ خام نظر آتی ہے۔ وہ وہاں سے بھی مایوس واپس آتا ہے۔ غرضیکہ وہ انسانوں کے اس ہجوم میں اپنے آپ کو تنہا پاتا ہے۔ اسے کوئی ایسا دوسرا انسان نہیں ملتا جس سے اپنے دل کی تپش و خلش اور سوز و گداز کا حال کہہ سکے۔ وہ اس تنہائی سے اکتا جاتا ہے تو آسمان کی طرف آنکھ اٹھا کر پکار اٹھتا ہے کہ ؎

دریں میخانۂ اے ساقی ندارم محرمے دیگر
کہ من شاید نخستیں آدمم از عالمے دیگر

تفکر و تدبر وہ انسانوں کی بستیوں میں اپنے دل کی پکار کا کوئی جواب نہیں پاتا تو باہر فطرت کی کھلی فضاؤں میں چلا جاتا ہے۔ وہاں کبھی صحراؤں کی ناپید اکنار وسعتوں پر غور کرتا ہے اور کبھی آسمانوں کی حدود فراموش پہنائیوں پر۔ گاہ اُسے ستاروں کی تابندگی دعوتِ غور و تفکر دیتی ہے اور گاہ ماہ عالمتاب کی درخشندگی اس کے لئے سامانِ تدبر و تفحص پیدا کرتی ہے۔ وہ مظاہرِ فطرت کی گوناگوں نیرنگیوں پر غور کرتا ہے اور بار بار اپنے دل سے سوال کرتا ہے کہ یہ عظیم الشان سلسلۂ کائنات کس طرح وجود میں آگیا؟ کون اسے بایں حسن و خوبی چلا رہا ہے؟ اس کا بالآخر مقصد کیا ہے؟ یہ سوالات رہ رہ کر اس کے دل میں پیدا ہوتے ہیں۔ لیکن اسے ان کا جواب کہیں سے نہیں ملتا۔ جب جواب نہیں ملتا تو اس سے اس کے دل کا اضطراب اور بڑھ جاتا ہے۔ اور جب اضطراب بڑھتا ہے تو اس کے ساتھ ہی تشنگیٔ ذوق کی شدت تیز سے تیز تر ہو جاتی ہے۔ لیکن اسے اپنے آپ پر ضبط اتنا ہے کہ وہ اس کا ورثِ اضطراب کو اپنے معمولاتِ زندگی پر قطعاً اثر انداز نہیں ہونے دیتا۔ وہ اپنے کاروباری معاملات، بال بچوں کی نگہ و پرداخت، رفقا و احباب سے میل ملاقات۔ معاشرتی زندگی کے مقتضیات میں کوئی فرق نہیں آنے دیتا۔ اور ایسی زندگی بسر کئے جاتا ہے کہ اس کے ابنائے جنس اپنے میں اور اس میں کوئی فرق محسوس نہیں کرتے بجز اس کے کہ وہ اس کے کیریکٹر کی بلندی کے مداح ہیں۔ اور اس کی صداقت و دیانت کے معترف۔ چھوٹا بڑا سب اس کی عزت کرتے ہیں۔ قوم اور خاندان کو اس کی شرافت و اصالت پر ناز ہے۔ لیکن وہ اپنے آپ کو ان سے کچھ مختلف محسوس کرتا ہے اس لئے کہ جن گوشوں کو انہوں نے اپنے لئے وجۂ اطمینان اور موجبِ تسکین قرار دے رکھا ہے وہ ان میں سے کسی میں بھی اپنے اضطراب کا مداوا نہیں پاتا۔ وہ اپنے آپ کو ہر وقت کسی ایسی چیز کی تلاش میں مضطرب و بے قرار پاتا ہے جس کا اُسے

خود بھی علم نہیں کہ وہ کیا ہے! کارلائل کے الفاظ ہیں۔

"شروع ہی سے چلتے پھرتے آپ کے دل میں ہزاروں سوالات پیدا ہوتے تھے،

میں کیا ہوں؟

کائنات کا لامتناہی سلسلہ کیا ہے؟

زندگی کیا ہے؟

موت کیا ہے؟

مجھے کس چیز پر ایمان رکھنا چاہیئے؟

حرا اور غاران کی پہاڑیاں، ریت کے ٹیلوں کا سکوت، ان سوالات کا کوئی جواب نہیں دیتے۔ ان سوالات کا جواب کہیں سے نہیں ملتا۔ ان سوالات کا جواب انسان کی اپنی روح اور خدا کی وحی سے ملتا تھا جو اس روح کو اپنا مسکن بنالے۔

(HEROES AND HERO-WORSHIP P. 49)

ہاں! ان سوالات کا جواب کہیں سے نہیں مل سکتا۔ ان کا جواب صرف وحی کی زبان سے مل سکتا تھا۔ اور نبی قبل از نبوت وحی سے واقف نہیں ہوتا[1]۔ یہی کیفیت قبل از رسالت حضورؐ کی تھی......

(معراج انسانیت صفحہ ۱۸۶—۱۸۸)

اس کے بعد حضورؐ شرف نبوت سے سرفراز فرمائے گئے۔

(۵) ہجرت (نبوت کے تیرہ سال بعد)

(مدینہ کی طرف تشریف آوری)

تین شب و روز حضورؐ نے اپنے یار غارؓ کے ساتھ یہیں بسر کئے۔ چوتھی شب حضرت ابوبکرؓ کے گھر سے سواری کی اونٹنیاں آگئیں اور آپ آگے روانہ ہو گئے۔ مدینہ میں اطلاع پہنچ چکی تھی کہ آپؐ نے مکہ چھوڑ دیا ہے۔ تمام انصارؓ

---

[1] نبوت خالصۃً خدا کی موہبت ہوتی تھی جس میں ہونے والے نبی کے اپنے ملکہ یا کسب و ہنر کا کوئی دخل نہیں ہوتا تھا۔ خدا جس ذات کو اس منصب جلیلہ کے لئے منتخب کر لیتا تھا اسے اپنے پروگرام کے مطابق، ایک وقت معینہ پر نبوت عطا کر دیتا تھا یہی وجہ تھی کہ نبی کو قبل از نبوت، وحی کا علم نہیں ہوتا تھا۔ (حضورؐ کے بعد نبوت کا سلسلہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو گیا۔ پرویز)

وفورِ شوق و جذبۂ محبت سے سرشار صبح نور کے تڑکے بستی سے باہر آ کر دیدہ و دل فرش راہ کیے انتظار میں بیٹھ جاتے ہر روز صبح یہی کیفیت رہتی۔

محبوب اور ایسا جاں نواز محبوب! انتظار اور ایسا سرور آمیز انتظار! کیا وجد انگیز تھا یہ منظر!!!

قریش نے حضرتؐ کی گرفتاری پر سو اونٹ کا انعام مشتہر کر رکھا تھا۔ بریدہ اسلمی، ایک قبیلہ کا سردار۔ اس انعام کے لالچ سے حضورؐ کی تلاش میں نکلا۔ حضورؐ کو راہ میں پالیا۔ جب سامنے آیا اور ہمکلام ہوا تو اثر و جذب کا ایک تیر تھا جو سیدھا

دشمن سامنے

دل تک اتر گیا اور اپنی قوم کے ستّر آدمیوں سمیت مسلمان ہو گیا۔ جوشِ مسرت سے اپنی سفید پگڑی نیزہ پر باندھ کر اس کاروان رشد و سعادت کے آگے آگے چل پڑا۔ پگڑی کا پھریرا ہوا میں لہراتا اور رقص انگیز انداز سے بشارتیں سناتا چلا جا رہا تھا کہ "امن کا بادشاہ، صلح کا حامی، دنیا کو انصاف و عدالت سے بھرپور کر دینے والا" آ رہا ہے۔ اس طرح رواں دواں، نور و نکہت کی ہزار دنیائیں اپنے جلو میں لئے، یہ قافلۂ جذب و سرور، مدینہ کی طرف بڑھتا گیا۔ اور ۸ ربیع الاول (۲۳ ستمبر) کی صبح مدینہ کے قریب جا پہنچا۔ مشتاقین کی

مدینہ میں تشریف آوری

جماعت حسب معمول انتظار کے بعد واپس لوٹ چکی تھی۔ ایک یہودی نے دور سے دیکھا تو قرائن و آثار سے معلوم کر لیا کہ وہی قافلہ ہے جس کے انتظار میں اتنے دنوں سے انصار کی آنکھیں فرش راہ بن رہی ہیں۔ اس نے آواز دی کہ "اہلِ عرب۔ لو، جس کا تم انتظار کر رہے تھے وہ آگیا۔" تمام شہر اللہ اکبر کے نعروں سے گونج اٹھا اور انصار ہتھیاروں سے سج سج کر بیتابانہ گھروں سے نکل آئے اور پروانہ وار اس آواز کی سمت بڑھے۔ مدینہ سے تین میل کے فاصلہ پر انصار کے کچھ خاندان آباد تھے۔ اس بستی کو قبا کہتے ہیں۔ حضورؐ یہاں پہنچے تو تمام خاندان نے جوش مسرت میں نعرہ ہائے تکبیر بلند کیے۔ ان کے مقدر نے یاوری کی اور حضورؐ نے ان کی میزبانی قبول فرما لی۔ چودہ دن کے بعد آپ شہر کی طرف روانہ ہوئے۔ راہ میں بنی سالم کے محلہ میں جمعہ کی نماز ادا فرمائی۔ قبا سے مدینہ تک راستہ میں دو رویہ فدائیوں کی صفیں تھیں۔ سارا شہر جوشِ مسرت اور فرطِ عقیدت سے معمورۂ جذب و نشاط اور گہوارۂ حسن و بہار بن رہا تھا۔ گلی کوچوں سے تحمید و تقدیس کے نغمے اور تسبیح و تہلیل کے زمزمے ساری فضا کو کیف بار اور مسرت بیز بنا رہے تھے۔ جوشِ استقبال سے ساتگین قلوب اس طرح بے محابا چھلک رہے تھے کہ صہبائے محبت مسرت و ابتہاج کے نورانی آنسوؤں کی شکل میں دامان آستین کو صحنِ گلستاں و کفِ باغباں بنا رہی تھی۔ کہیں وفورِ تشکر و امتنان سے جبیں ہائے نیاز بحضور رب ذوالمنن سجدہ ریز و زمین بوس تھیں۔ اور کہیں ہجوم جذبات سے مرتعش ہاتھ تھے کہ بارگاہِ صمدیت میں اس مہمان عزیز کی خیرسگالی اور خوش بختی کی حسین دعائیں اور معصوم التجائیں لئے یوں جانب عرش عظیم اٹھ رہے

تھے جیسے دشت ساکت وخاموش میں نخیل بلند ایستادہ ہوں۔ خاکِ یثرب کے ذرات ابھر ابھر کر ہمہ تن دیدہ بن گئے تھے کہ انہیں آج اس ذات اقدس واعظمؐ کی کفش بوسی کی سعادت نصیب ہونے والی تھی جو تمام عالم کے لئے سرمایۂ فخر ومباہات تھی۔ چھوٹی چھوٹی لڑکیاں جوشِ مسرت میں دف بجاتیں اور یہ استقبالی نغمہ گاتی تھیں کہ

طَلَعَ الْبَدْرُ عَلَيْنَا
مِنْ ثَنِيَّاتِ الْوَدَاعِ
وَجَبَ الشُّكْرُ عَلَيْنَا
مَا دَعَا لِلّٰهِ دَاعِ

خلوص ومحبّت کے ان روح پرور نظاروں میں یہ کاروانِ حسن وخوبی یثرب کی بستی میں داخل ہوا جس کا نام اس کے بعد مدینۃ النبیؐ ہوگیا۔ (معراج انسانیت۔ صفحہ ۳۷۵ – ۳۷۶)

---

(۶) حسنِ سیرت کی رعنائیاں

حیات نبویؐ کے اوراق الٹیے اور ایک طائرانہ نگہ بازگشت ڈالیے ان تمام احوال وظروف اور کوائف وحوادث پر جو اس داستانِ اطہر واقدس کے اجزاء وعناصر ہیں۔ دیکھئے اور غور کیجیے کہ اس پوری داستانِ حیات میں کس طرح زندگی اپنی انتہائی تابناکیوں اور ضوفشانیوں، سرگرمیوں اور حرارت آمیزیوں، جمال آفرینیوں اور جلال انگیزیوں، سیرابیوں اور شادابیوں، کامرانیوں اور کامجوئیوں، ناپیدا کنار وسعتوں اور بے پایاں گہرائیوں کے ساتھ مصروف عمل نظر آتی ہے۔ زندگی نہیں، ایک کاروانِ ذوق وشوق ہے، جو یقینِ کامل اور ایمان محکم، حسنِ عمل اور جوششِ کردار، تطہیرِ فکر اور پاکیزگیِ نگاہ، کشادہ ظرفی اور بلند نگہی، سوز وساز، اور تپش وخلش کی ایک دنیا اپنے جلو میں لئے انتہائی جذب وانہماک کے ساتھ ابن وآن کی دامن کشیوں سے بے خبر اور گرد وپیش کی عناں گیریوں سے بے نیاز، اپنی متعین منزل کی طرف مستانہ وار بڑھے چلا جا رہا ہے۔ نہ راستہ کے خطرات اس کے دل میں خوف وخطر پیدا کرتے ہیں۔ نہ سفر کی صعوبات اس کے پائے استقامت میں لغزش کے آثار نمودار کرتی ہیں۔ گوئٹے کے الفاظ میں 'زندگی نہیں، ایک جوئے رواں ہے کہ ناسازگاریِ حالات وناموافقت زمانہ کی ہر چٹان اس کی رفتار میں اور تیزی اور اس کی موجوں میں مزید خوش خرامگی پیدا کردیتی ہے۔

بنگر کہ جوئے آب چہ مستانہ می رود ‎ ‎ ‎ ‎ مانند کہکشاں بگریبانِ مرغزار

درخوابِ ناز بود بہ گہوارۂ سحاب — واکرد چشم شوق بآغوشِ کوہسار
از سنگ ریزہ نغمہ کشاید خرامِ او — سیمائے او چوں آئینہ بے رنگ و بے غبار

زی بحرِ بیکرانہ چہ مستانہ می رود
در خود یگانہ، از ہمہ بیگانہ می رود

یہ جوئے رواں نہ صرف ہجوم تزاحم اور انبوہ تصادم کی سنگلاخ زمینوں ہی سے مستانہ وار گزرتی آئی ہے بلکہ کشش و جاذبیت کی ہر وادیٔ رنگ و تعطر اور امیال و عواطف کے ہر دامنِ کیف و نکہت پر ایک نگہ تبسم ڈالتی، کج کلہانہ انداز سے آگے بڑھتی چلی جاتی ہے۔

درراہ او بہار پریخانہ آفرید — نرگس دمید و لالہ دمید و سمن دمید
گل عشوہ داد و گفت یکے پیشِ ما بایست — خندید غنچہ و سرِ دامانِ او کشید
ناآشنائے جلوہ فروشانِ سبز پوش — صحرا برید و سینۂ کوہ و کمر درید

زی بحرِ بیکرانہ چہ مستانہ می رود
در خود یگانہ، از ہمہ بیگانہ می رود

(معراج انسانیت-صفحہ ۷۶۱ - ۷۶۲)

---

(۷) مقامِ محمودیتؐ - (آخری باب)

دنیائے انسانیت میں آج جو کچھ قابل حمد و ستائش اور درخور تحسین و تبریک نظر آتا ہے وہ اسی وجہ سے ہے کہ وہ "بالواسطہ یا بلا واسطہ" ایک نسبت رکھتا ہے ذاتِ محمد رسول اللہ سے اور جو انسان چاہتا ہے کہ وہ درخور حمد و ستائش ہو جائے، وہ شعوری یا غیر شعوری طور پر اسی کوشش میں ہے کہ اس راستہ پر چل نکلے جو سیرت محمدیہ نے دنیا میں متعین کر کے دکھایا۔

ہر کجا بینی جہانِ رنگ و بو
آنکہ از خاکش بروید آرزو
یا ز نورِ مصطفیٰ[۱] او را بہاست
یا ہنوز اندر تلاشِ مصطفیٰؐ است

آج محفلِ کائنات میں کوئی شمع جلوہ فگن نہیں جو اس سراجِ منیر سے کسبِ ضیا نہ کر رہی ہو۔ اس تیرہ سو سال کی تاریخ پر نگاہ ڈال لیجئے اور پھر دیکھئے کہ دنیا آہستہ آہستہ اسی نظام کی طرف آ رہی ہے یا نہیں جو محمد رسول اللہ و الذین معہ نے اس دنیا میں متشکل کر کے دکھایا تھا۔ دیکھئے کہ اس عرصے میں جس قدر انقلابات دنیا میں آئے اور جنہیں دنیا نے نوعِ انسانی کے لئے موجبِ خیر و برکت قرار دیا ان کا سرچشمہ کہاں تھا؟

(معراج انسانیت۔ صفحہ ۷۸۷۔ ۷۸۸)

انسانیت کے معراجِ کبریٰ اور شرفِ اعلیٰ کا یہی وہ مقام ہے جس کے پیشِ نظر، خدا اور اس کے فرشتے، اس ذاتِ گرامی کو مستحق ہزار تحسین و تبریک قرار دیتے ہیں۔

إِنَّ اللّٰهَ وَمَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ ۚ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا ۝ (۳۳/۵۶)

گہر ہائے تابدار

(چند احادیث مقدسہ، جو طلوعِ اسلام کے ٹائیٹل پر وقتاً فوقتاً شائع ہوتی رہیں)

- رسول اللہ نے وفات کے وقت کچھ نہیں چھوڑا۔ نہ درہم نہ دینار۔ نہ غلام نہ لونڈی۔ نہ کوئی اور شے۔ صرف اپنا سفید خچر اور ہتھیار۔ اور کچھ زمین جسے عام مسلمانوں کے لئے چھوڑ دیا۔

(بخاری)

- رسول اللہ نے فرمایا — ہمارا کوئی وارث نہیں۔ جو چھوڑا ہے وہ عام مسلمانوں کے لئے ہے۔

(بخاری)

- حضرت علیؓ کی روایت ہے کہ ——— رسول اللہ نے فرمایا کہ خبردار فتنہ واقع ہوگا۔ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ اس سے کیونکر نجات ہوگی؟ آپ نے فرمایا کہ کتاب اللہ و پر عمل کرنے سے۔ جس میں تمہارے درمیان (حرام و حلال یا طاعت و گناہ وغیرہ کا)

حکم ہے۔ اور حق و باطل کے اندر قول فیصل ہے۔ جس متکبر نے قرآن کو چھوڑا ہلاک کرے گا اس کو اللہ۔ جس نے قرآن کی طرف لوگوں کو بلایا... اس کو سیدھی راہ دکھائی گئی۔

(مشکوٰۃ بحوالہ ترمذی۔ دارمی)

○ رسول اللہؐ نے فرمایا کہ میرے بعد تم سے بہت سی احادیث بیان کی جائیں گی۔ سو جب کوئی حدیث میری طرف سے بیان کی جائے تو اسے کتاب اللہ کے سامنے پیش کرو۔ جو اس کے موافق ہو اسے قبول کر لو۔ جو اس کے خلاف ہو اسے رد کر دو۔

(بحوالہ کتاب التوضیح والتلویح صفحہ ۴۸۰)

○ رسول اللہؐ نے فرمایا کہ زمین اللہ کی ہے اور بندے بھی اللہ ہی کے ہیں۔ اس لئے زمین اللہ کے بندوں کے لئے رہنی چاہیئے کسی کی ذاتی ملکیت نہیں ہونی چاہیئے۔

(کتاب الاموال)

○ (امام بخاریؒ) عبد العزیز بن رفیعؓ سے روایت کرتے ہیں کہ میں اور شداد بن معقلؓ حضرت عبد اللہ ابن عباسؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ پھر شداد بن معقل نے ان سے دریافت کیا "کیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی چیز چھوڑی تھی؟" انہوں نے جواب دیا "آپ نے ما بین الدفتین (یعنی مجلد قرآن مجید) کے علاوہ کچھ نہیں چھوڑا۔" عبد العزیز بن رفیعؓ کہتے ہیں کہ پھر ہم دونوں محمد بن الحنفیہؓ کی خدمت میں پہنچے۔ اور ان سے بھی یہی بات دریافت کی۔ انہوں نے کہا "آپ نے ما بین الدفتین کے علاوہ کچھ بھی نہیں چھوڑا۔"

(صحیح البخاری۔ جلد سوم صفحہ ۱۴۳۔ مطبوعہ بہیۃ مصریہ)

○ رسول اللہؐ نے فرمایا ـــ میرے ورثاء میں ایک دینار بھی بطور ترکہ تقسیم نہ ہوگا۔ میری بیویوں کی ضروریات اور منتظم کی خوراک کے بعد جو کچھ بھی بچے وہ صدقہ ہوگا۔

(بخاری جلد ۴۔ کتاب الفرائض)

○ رسول اللہؐ نے اپنے آخری حج کے خطبہ میں فرمایا ـــ میں تم میں ایک ایسی چیز چھوڑے جاتا ہوں جس سے اگر تم وابستہ رہے تو کبھی گمراہ نہیں ہوگے ـــ وہ چیز کتاب اللہ ہے۔

(مسلم۔ نسائی۔ ابو داؤد)

○ حضرت ابو موسیٰؓ سے روایت ہے کہ اشعر کے قبیلہ والوں کے ہاں یہ دستور تھا کہ جب کسی جنگ میں ان کے پاس کھانا تھوڑا رہ جاتا یا مدینہ میں ان کے بال بچوں پر فاقہ کی نوبت آجاتی تو یہ لوگ سب اپنے اپنے کھانوں کی چیزوں کو ایک جگہ جمع کر لیتے۔ اور ایک برتن میں برابر حصے لگا کر آپس میں تقسیم کر لیتے۔

رسول اللہؐ نے فرمایا کہ یہ لوگ مجھ سے ہیں اور میں ان سے ہوں۔

(بخاری۔ مسلم)

○ حضرت ابو سعید خدریؓ سے روایت ہے کہ ہم رسول اللہؐ کے ساتھ سفر میں تھے۔ ایک شخص آیا اور دائیں بائیں دیکھنے لگا۔ آپؐ نے فرمایا جس کے پاس سواری ضرورت سے زیادہ ہو وہ اس شخص کو دیدے جسے اس کی ضرورت ہو۔ جس کے پاس زادِ راہ ضرورت سے زیادہ ہو وہ اُسے دیدے جس کے پاس نہ ہو۔ اس طرح آپ نے بہت سی چیزوں کا ذکر فرمایا۔ حتیٰ کہ ہم نے سمجھ لیا کہ ہم میں سے کسی کو ضرورت سے زیادہ کوئی چیز ...... رکھنے کا حق نہیں۔

(مسلم بحوالہ ریاض الصالحین امام نوویؒ)

○ فرمایا رسول اللہؐ نے کہ ہر نبی کو بقدر ان لوگوں کے جو اس پر ایمان لائے، معجزے دیئے گئے لیکن میرا معجزہ تو وحی (قرآن) ہے جو خدا نے مجھ پر بھیجی ہے۔ (چونکہ یہ معجزہ دائمی اور تمام نوعِ انسانی کے لئے ہے) اس لئے مجھے امید ہے کہ سب انبیاء سے زیادہ قیامت کے روز میری امت ہوگی۔

(بخاری جلد سوم۔ باب فضائل القرآن)

○ رسول اللہؐ نے فرمایا کہ اگر تم پر کوئی ایسا حبشی غلام بھی، جس کا سر کشمش کی طرح چھوٹا ہو، امیر بنا دیا جائے، تو جب تک وہ کتاب اللہ کے مطابق چلائے اس کی سنو اور اس کی اطاعت کرو۔

(بخاری)

○ فرمایا کہ مجھ سے (قرآن کے علاوہ) کوئی بات نہ لکھو اور جس نے قرآن کے علاوہ کچھ اور لکھ لیا ہو وہ اسے مٹا ڈالے۔

○ حضور نبی اکرمؐ نے فرمایا کہ جس بستی میں کسی شخص نے اس حال میں صبح کی کہ وہ رات بھر بھوکا رہا اس بستی کی حفاظت و نگرانی کا ذمہ ختم ہوا۔

(مسند امام احمد)

اتحاد پرنٹنگ پریس ٹمپل روڈ لاہور

-/25 paisa

ڈاکٹر کی مشکلات

ڈاکٹر زاہدہ درّانی (ایم۔بی۔بی۔ایس) ۲۸ فاضلیہ کالونی۔ فیروز پور روڈ۔ لاہور

صدرِ محترم۔ میری بہنو، بھائیو اور بزرگو!

میری اس مختصر سی تقریر کا موضوع ہے "ڈاکٹر کی مشکلات"۔ اس سلسلہ میں ڈاکٹر کی زندگی کے دونوں حصے سامنے آجائینگے ایک حصّہ وہ جس میں وہ ابھی ڈاکٹر بن رہا ہوتا ہے۔ یعنی اُس کی طالب علمی کا زمانہ۔ اور دوسرا حصہ وہ جس میں وہ ڈاکٹری کرتا ہے جہاں تک اُس کی طالب علمی کے زمانے کا تعلق ہے، وہ پہلے سائنس کا سٹوڈنٹ ہوتا ہے، اور اس کے بعد میڈیکل کالج میں آجاتا ہے۔ اگرچہ اُس کی سائنس کی تعلیم ابتدائی ہوتی ہے، لیکن اُس کا سارا تعلق طبیعاتی دنیا (PHYSICAL WORLD) سے ہوتا ہے۔ میڈیکل کالج میں انسان کے جسم کی مشینری' اس کی بیماریوں اور بیماریوں کے علاج کی تعلیم دیجاتی ہے۔ بظاہر ایسا نظر آتا ہے کہ اس قسم کی تعلیم کا انسان کے معتقدات اور اخلاقیات سے کوئی تعلق نہیں ہوسکتا، لیکن حقیقت یہ نہیں۔ یہ تعلیم طالبِ علم کے دل اور دماغ کو غیر شعوری طور پر متاثر کئے جاتی ہے۔ اور رفتہ رفتہ اُسے اور ہی سانچے میں ڈھال دیتی ہے۔ اُسے انسان کا سینہ چیر کر دکھا دیا جاتا ہے کہ اس میں دل ہے، پھیپھڑے ہیں، جگر ہے، گردے ہیں۔ گوشت، پوست، لہو اور ہڈیاں ہیں۔ اور ان کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ جسم کی حرارت سے خون میں گردش پیدا ہوتی ہے، اور اسی سے یہ زندہ رہتا ہے۔ جب یہ حرارت اور حرکت ختم ہوجاتی ہے تو انسان مرجاتا ہے۔ پھر مُردے کو چیر پھاڑ کر دکھایا جاتا ہے کہ اس میں وہ سب کچھ موجود ہے جو زندہ انسان میں تھا، اور چند دنوں کے بعد یہ گل سڑ جائے گا۔ پھر یہ بتایا جاتا ہے کہ یہ کچھ انسان ہی سے مخصوص نہیں، تمام حیوانات کی یہی حالت ہے۔ اس سے طالبِ علم کے دل میں آہستہ آہستہ' یہ خیال جاگزیں ہوجاتا ہے کہ انسان، حیوان ہی کی بڑھی ہوئی شکل ہے۔ اس کا جسم، طبیعاتی قوانین کے مطابق زندہ رہتا ہے، اور انہی کے مطابق اس کی موت واقع ہوجاتی ہے۔ جب موت سے اس کا جسم گل سڑ جاتا ہے تو انسان کا بھی خاتمہ ہوجاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جب انسانی زندگی کے متعلق یہ نظریہ قائم ہوجائے تو پھر زندگی کا مقصد جسم کی پرورش اور آسائش کے علاوہ کچھ نہیں رہتا۔ نہ انسان کے سامنے کوئی بلند اقدار رہتی ہیں۔ نہ عقل سے ماوراء کسی اور راہ نمائی کی ضرورت کا احساس۔ نہ قانونِ مکافاتِ عمل کا تصوّر سامنے آتا ہے، نہ موت کے بعد زندگی کا خیال۔ نتیجہ اس کا یہ کہ جب طالبِ علم کالج سے باہر آتا ہے۔ تو وہ مغرب کے مادّی نظریۂ حیات میں ڈوبا ہوا ہوتا ہے۔

میری تعلیم، لڑکیوں کے میڈیکل کالج میں ہوئی تھی۔ اس میں اکثر لڑکیاں ایسی بھی ہوتی تھیں جن کے گھر کا ماحول بالا ابتدائی

تعلیم مذہبی ہوتی تھی۔ جب کالج کی تعلیم اور ان کی مذہبی تعلیم و تربیت میں ٹکراؤ ہوتا تو وہ ایک عجیب کشمکش میں مبتلا ہو جاتیں۔ اُن کی مذہبی تعلیم، سائنس کے پیدا کردہ اعتراضات کا مقابلہ کرنے کے لئے ناکافی ہوتی۔ نتیجہ یہ کہ اُن میں سے کچھ تو مذہب سے برگشتہ ہو کر، خالص مادیت کے آغوش میں چلی جاتیں۔ جو اس کا مقابلہ کرتیں وہ دونوں میں مفاہمت (COMPRO-MISE) کی یہ صورت پیدا کرتیں کہ سائنس کا دائرہ الگ ہے اور مذہب کا الگ۔ اس کے بعد ان لڑکیوں (یعنی ان لیڈی ڈاکٹرس) کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ یہ اپنے مذہبی جذبہ کی تسکین، ورد وظائف اور نذر نیاز سے کر لیتی ہیں، اور ڈاکٹری کاروبار میں ان کا نقطۂ نظر خالص مادیت کا ہوتا ہے۔

آپ نے غور فرمایا کہ جس تعلیم کے متعلق عام اندازہ یہ ہے کہ اس کا انسان کی مذہبی دنیا سے کوئی تعلق نہیں ہو سکتا، وہ کس طرح طالبِ علموں کے بنیادی تصوّرات تک کو بدل دیتی ہے۔ یہ ہے پہلی دشواری۔ دوسری دشواری اُس وقت پیدا ہوتی ہے، جب ڈاکٹر پریکٹس شروع کرتے ہیں۔ یہ دشواری انھیں پیش آتی ہے جو انسانی ہمدردی کا جذبہ دل میں لئے ہوئے آتے ہیں۔ ہمارے ملک کی نوّے فیصد سے بھی زیادہ آبادی مختلف امراض کا شکار ہوتی ہے۔ ان میں سے بیشتر ایسے ہوتے ہیں، جن کے ہاں نہ پیٹ بھر کر کھانے کو ہوتا ہے نہ سردی گرمی سے بچنے کا کافی سامان۔ تنگ و تاریک کوٹھڑیاں، جن میں نہ تازہ ہوا کا گذر، نہ دھوپ کا۔ غلاظت سے بھرا ہوا ماحول، گندی فضا، ناقص غذا۔ یہ جیتے جاگتے انسان نہیں، بلکہ چلتے پھرتے ہڈیوں کے ڈھانچے ہوتے ہیں۔ ان میں عورتوں اور بچّوں کی حالت اور بھی قابلِ رحم ہوتی ہے۔ سرِ دست ہمارے ہاں سرکاری ہسپتال اتنے زیادہ نہیں، جو ملک کی پوری آبادی کے لئے کافی ہو سکیں۔ اس لئے ان بیماروں کو پرائیویٹ ڈاکٹروں کے پاس جانا پڑتا ہے۔ اب سوچئے کہ جس ڈاکٹر کے سینے میں حسّاس دل ہو، اِن بیماروں کا علاج کرتے وقت اُس پر کیا گذرتی ہوگی؟ اگر وہ ان سے پیسے لیتا ہے تو اس کا دل کانپ اُٹھتا ہے۔ اور اگر نہیں لیتا تو بھوکا مرتا ہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ انسان ایک دو دن کے لئے تو بھوکا رہ سکتا ہے؛ مستقل طور پر ایسا نہیں کر سکتا۔ چنانچہ اُس کی زندگی ایک مستقل کشمکش بن جاتی ہے۔ اس کا انجام کیا ہوتا ہے؟ میں ابھی نہیں کہہ سکتی، اس لئے کہ میں اِس وادی میں ہنوز نووارد ہوں۔

جہاں تک طالبِ علمی کے زمانہ کی دشواری کا تعلق ہے، میں اس کے متعلق پچھلے سال تک تو کچھ نہیں کہہ سکتی تھی، لیکن سالِ گذشتہ میں نے جو قرآنی تعلیم "باباجی" سے حاصل کی ہے، اُس کی بنا پر یقین کے ساتھ کہہ سکتی ہوں کہ اگر ہمارے کالجوں میں زیادہ نہیں تو "سلیم کے نام خطوط" اور "انسان نے کیا سوچا؟" جیسی کتابیں بطورِ نصاب رکھ دی جائیں، تو ان کالجوں سے جو طالبِ علم باہر آئیں وہ بیک وقت اچھے ڈاکٹر اور بلند پایہ انسان ہوں جن کے سامنے زندگی کی مستقل اقدار اور اُن کی صداقت پر علیٰ وجہ البصیرت ایمان ہو۔

دوسری مشکل کا حل اس کے سوا کچھ نہیں کہ عوام کی صحت اور ڈاکٹروں کی ضروریاتِ زندگی، دونوں کی ذمہ داری

(بقیہ صفحہ ۱۱۱ پر)

عورت کی مظلومی کے اسباب

پروفیسر شمیم انور (ایم۔اے) کمنیرڈ کالج۔ لاہور

[اصل تقریر انگریزی میں تھی۔ اس کا اردو ترجمہ درج ذیل ہے۔ اصل تقریر بطور ضمیمہ شامل ہے۔]

آج شام خواتین و حضرات! میں چاہتی ہوں کہ عورت کی زندگی سے متعلق چند ٹھوس، لیکن تلخ حقائق پر اپنی بصیرت کے مطابق روشنی ڈالنے کی کوشش کروں۔ عورت کی محکومی اور مظلومی کی داستان طویل ہے۔ اس پر بہت کچھ لکھا بھی جا چکا ہے۔ اور اب تو زمانہ اس حقیقت کو بھی قبول کر چکا ہے کہ عورت کی مضمر صلاحیتوں کو کھلی فضا میں کبھی پنپنے کا موقعہ ہی نہیں ملا۔ آج وہ نسوانیت کی مسخ شدہ شکل ہے ——— اپنے وجود کا دھندلا سا نامکمل خاکہ ——— مجھے ہمیشہ وقت کے اس موڑ کی تلاش رہی ہے۔ جہاں پہنچ کر کاروانِ نسائیت اس طرح دو حصّوں میں بٹ گیا۔

عورت نے کب، کیوں اور کیسے اپنا مقام کھو دیا؟ وہ کونسے اسباب تھے جنھوں نے عورت سے اس کی شخصیت کی نشوونما کے تمام ذرائع چھین لئے اور اسے زندگی کی حیوانی سطح پر لا کھڑا کیا؟ عورت آج تک ان حد بندیوں سے آزاد کیوں نہ ہو سکی؟ انہی سوالات نے مجھے ہمیشہ پریشان رکھا ہے۔ اور آج معزز خواتین و حضرات! انہی سوالوں کے حل ——— جو میں نے ذاتی مشاہدے اور مطالعے کی مدد سے ڈھونڈ نکالنے کی کوشش کی ہے ——— آپ کے سامنے پیش کرنے کی جرأت کروں گی۔

قدرت نے نسلِ انسانی کو قائم رکھنے اور آگے بڑھانے کا اہم فریضہ، عورت کو سونپ رکھا ہے۔ اسی حیاتیاتی فریضہ (BIOLOGICAL FUNCTION) کی سر انجام دہی عورت کو کچھ عرصہ کے لئے عملی کاموں سے معذور کر دیتی ہے۔ اس معذوری کے زمانے میں زندگی کے طبعی تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے اسے کسی ایسے سہارے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے، جو عملی دنیا میں کبھی اس کی طرح بے بس ہو کر نہ رہ جائے۔ فطرت کے نقشے میں یہ سہارا مرد ہے۔ لاچاری کے دنوں میں تمام تر ضروریاتِ زندگی کے لئے عورت کو مرد کا رہینِ منّت ہونا پڑتا ہے۔ اور حیوانی سطحِ زندگی کا اصول ہے کہ محتاج کو بے بس سمجھ کر اُس کی زیر دستی سے پُورا پُورا فائدہ اٹھایا جائے اور اس کے حقوق کو جہاں تک ہو سکے پامال کیا جائے۔ عورت کے ساتھ بھی یہی سلوک کیا گیا۔ لیکن وہ تحفّظِ خویش (SELF PRESERVATION) اور اس سے زیادہ۔ تحفّظِ اولاد کی خاطر یہ سب کچھ برداشت کرتی رہی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مرد اور عورت کے درمیان حاکم و محکوم کا یہ رشتہ پختہ تر ہوتا چلا گیا۔ اور زندگی کی اس مکروہ شکل کو جائز اور عین فطرت کے مطابق سمجھا جانے

لگا ـــــ طبعِ انسانی کی افتاد کچھ ایسی ہی واقع ہوئی ہے کہ اگر اکثریت کسی عمل کو کچھ عرصہ تک دُھراتی رہے تو اس عمل کے جواز کے لیے کسی اور دلیل کی ضرورت محسوس نہیں کی جاتی۔ اور اس کی مخالفت کو فطرت کی مخالفت سمجھا جانے لگتا ہے۔

تصریحاتِ بالا سے، ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ عورت کی محکومی اور مظلومی کی ایک وجہ اس کی معاشی معذوریاں ہیں۔ زیادہ وضاحت کیلئے قبائلی طرزِ زندگی کی دو بنیادی شکلوں ـــــ (MATRIARCHAL & PATRIARCHAL) کا مطالعہ مفید ثابت ہوگا ـــــ یعنی وہ معاشرہ جس میں مرد بزرگِ خاندان ہوتا تھا اور وہ جس میں عورت کو یہ منصب حاصل ہوتا تھا۔

ایسی مثالیں بھی دیکھنے میں آئی ہیں جب واقعی تندرست و توانا عورتوں نے حمل کے ایّام میں بھی معذور ہو کر گھر بیٹھنے کے بجائے اکتسابِ رزق میں مَردوں کا ساتھ دیا ہے۔ اور بچّے کی پیدائش کو عملی کاموں کی سرانجام دہی پر کسی طرح اثر انداز نہیں ہونے دیا۔

دنیا کے ایسے حصّوں میں بھی جہاں حصولِ معاش کے لئے زیادہ جدوجہد کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ عورتوں نے میدانِ عمل میں مَردوں کے ساتھ برابر کا حصّہ لیا ہے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ انسانی معاشرت کی تاریخ میں (MATRIARCHAL) "مادری نظامِ زندگی" اسی قسم کے ماحول کی پیداوار ہے۔ اور (PATRIARCHAL) "پدری نظامِ زندگی" ان اسباب کی عدم موجودگی کا مظہر ہے۔

آج (PATRIARCHAL) "پدری نظامِ زندگی" دنیا کے زیادہ تر حصّوں میں مقبول ہے۔ لیکن (MATRIARCHAL) "مادری نظامِ زندگی" کی ایک دو مثالیں بھی یہ ثابت کرنے کے لئے کافی ہیں کہ اگر عورت کی معاشی معذوریوں کو دُور کر دیا جائے تو اس کی شخصیت کی نشو و نما کے امکانات ایک بار پھر تازہ ہو جائیں اور وہ اپنے کھوئے ہوئے مقام کو پھر پا جائے۔

دنیا میں ظلم و استبداد۔ خود غرضی و مفاد پرستی کا ہاتھ عورت ہی کی رگِ جان تک پہنچا ہے۔ حیوانی سطح کی زندگی، تمام انسانوں کو بڑے چھوٹے دائروں میں تقسیم کر دیا کرتی ہے۔ جس میں ہر دائرہ اپنے تحفّظ کے لئے اپنے سے چھوٹے دائرے کو نگلتا رہتا ہے۔ اسی اصول کے تحت زمیندار نے کاشتکار کو اپنا محکوم بنایا۔ سرمایہ دار نے مزدور کی بے بسی سے فائدہ اٹھایا۔ صاحبِ زر اقوام نے غریب اقوام کو تختۂ مشق بنایا۔ مالک نے نوکر پر اور افسر نے ماتحت پر رُعب جمایا اور مَرد نے عورتوں کو مظلوم بنایا۔ ملوکیت نے بھی اپنے تحفّظ کی خاطر ضروریاتِ زندگی کو اتنے فاصلے پر رکھا جہاں تک پہنچنے کے لئے عام افراد کو اپنے پسینے کا آخری قطرہ تک بہا دینا پڑے۔ (یہ امر دلچسپ ہے کہ حصولِ معاش کے سلسلہ میں امیر و غریب، حاکم و محکوم کی جماعتی تفریق کے ساتھ ساتھ ـــــ معاشی اصطلاح میں ـــــ عورت بھی ایک طبقہ قرار پا گئی)۔

حکومت کا نشہ، افیون کے نشہ سے کم نہیں ہوا کرتا۔ وہ اختیار و تسلّط جو حاکم کو محکوم پر، طاقت ور کو کمزور پر، مرد کو عورت پر کچھ عرصہ کے لئے حاصل ہوا ہو، آسانی سے لوٹایا نہیں جا سکتا۔ اسے قائم رکھنے کیلئے جواز کی راہیں تلاش کی جاتی ہیں۔ انسانوں کے خود ساختہ مذاہب اس مشکل کو بھی حل کر دیتے ہیں۔ مذہبی رہنماؤں نے یقین دلایا کہ حاکم وقت کے احکام کی تعمیل خدا کے احکام کی تعمیل ہے۔ عورت کو فتنہ قرار دیا۔ اور کہا کہ آدم کو باغِ بہشت سے نکلوانے کی ذمّہ دار یہی ہے۔ اور چونکہ وہ آدم کی پسلی سے پیدا کی گئی ہے اور پسلی ٹیڑھی ہوتی ہے اس لئے اس کی اصلاح کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

اس قسم کے مذہب کی اس تائید نے عورت کی رہی سہی شخصیت کو پامال کر دیا اور محکومی و مظلومی کو تقدیس کا رنگ دیکر اس کی طرف سے احتجاج کے ہر امکان کا گلا گھونٹ کر رکھدیا۔ ادب کی دنیا بھی نسوانیت کی اس زخم خوردہ شکل کو اپنائے بغیر نہ رہ سکی وہ نئی نئی مثالوں اور تازہ محاوروں کی مدد سے اس کے نقوش کو عوام کے ذہنوں میں گہرا کرتی چلی گئی۔ چنانچہ آج ہم دیکھتے ہیں کہ اعلیٰ تعلیم یافتہ خواتین کو بلا جھجک (INTELLECTUAL MONSTROSITIES) "ذہین بلا" کے خطاب سے نواز دیا جاتا ہے۔ عورت کو ناقص العقل کہا جاتا ہے، اور اسی کم عقلی کو اس کے حسن و جاذبیت کا جزو قرار دیا جاتا ہے۔ اسے ناقابلِ اعتماد سمجھا جاتا ہے۔ کیونکہ شیکسپیئر نے کہہ دیا ("FRAILTY — THY NAME IS WOMAN") لغزش کا دوسرا نام عورت ہے۔

یہ نظریات خود عورت کے شعور کو بھی متأثر کئے بغیر نہ رہ سکے۔ مرد کا پیدا کیا ہوا احساسِ کمتری آہستہ آہستہ یقین کی صورت اختیار کر گیا۔ اپنی بیچارگی کو اس نے فطرت کا اٹل قانون سمجھنا شروع کر دیا۔ اور آج یہی کہنہ یقین اسکے اپنے حصولِ آزادئ فکر و عمل کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ بن چکا ہے۔

خواتین و حضرات! عورت کی مجبوریوں کی داستان یہیں ختم نہیں ہو جاتی۔ معاشی آزادی ہی اس کے تمام مسائل کا حل نہیں۔ وہ اگر یہ ثابت بھی کر دے کہ میدانِ عمل میں وہ مرد سے کسی طرح کمتر نہیں۔ پھر بھی وہ "عورت" ہی رہیگی۔

تہذیب و تمدّن کی وہ عمارت، جو انسان نے خود اپنی وضع کی ہوئی اقدار پر اٹھائی، اپنے ساتھ بہت سی نفسیاتی الجھنوں کو بھی لئے ہوئے تھی۔ ان میں سے ایک جنسیات کے متعلق غیر فطری نظریات کا بتدریج وجود میں آنا تھا۔

ان نظریات کی ابتداء دراصل خدا کے متعلق لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُولَدْ کے قدیم تصوّر سے ہوئی۔ تقدّس کے اس تصوّر سے متاثر ہو کر انسانوں نے جنسی میلانات اور تعلقات کو گناہ کے مترادف سمجھنا شروع کر دیا عیسائیت کی موجودہ شکل نے اس اندازِ فکر کو اور ہوا دی۔ کنواری مریمؑ کے تصورات نے حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش کو کسی قسم کے جنسی تعلق سے مبرّا قرار دیدیا۔ پھر خود حضرت عیسیٰؑ کی مجرّد زندگی نے زہد و تقدّس کے اس خاص رنگ کو اور گہرا کر دیا۔ موجودہ انجیل کے مطابق وہ گناہ، جس کی بدولت آدمؑ اور حوّاؑ کو باغِ بہشت سے حکم سزا ملا تھا، جنسی

تعلق ہی تھا۔ اور یہ آدمؑ اور حوّا کی ذات پر ہی ختم نہیں ہوگیا، بلکہ ہر انسانی بچے میں منتقل ہوتا چلا آیا ہے۔ اور اس کا واحد کفّارہ اور ازالہ حضرتِ عیسٰیؑ کی "پاکدامنی" پر ایمان ہے۔

حوّا کا قصور بھی شاید آدمؑ کی بیٹیوں میں منتقل ہوتا چلا آیا ہے۔ کیونکہ عیسائیت نے عورت کو فتنہ سمجھ کر اس سے دُور رہنے کی تلقین کی ہے۔ عورت نے ازل سے مرد کو بہکایا ہے۔ وہ شاید مرد کے زہد و تقوٰی کی آزمائش کے لئے پیدا کی گئی ہے۔ جو اس کے ہتھکنڈوں سے اپنے آپ کو بچائے رکھے وہی اپنے ایمان کی تکمیل کر سکتا ہے۔

اس عیسائی شریعت اور معتقدات کی ترویج کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ عورت کو انسان نہیں، بلکہ مرد کی حیوانی خواہشات کی تسکین کا ایک ذریعہ سمجھا جانے لگا۔ یہی وجہ ہے کہ ایک مرد کا طرزِ تخاطب عورت کے لئے وہی نہیں ہوتا جو اپنے ہی کسی ہم جنس کے لئے ہوتا ہے۔

عورت کی اس سے زیادہ توہین اور کیا ہو سکتی تھی خواتین و حضرات! کہ اُسے مستقل طور پر ایک ایسے تصوّر سے وابستہ کر دیا جائے جسے معاشرہ وجہِ ذلت و رسوائی قرار دے چکا ہو؟

اس لئے میں محسوس کرتی ہوں کہ جب تک جنسی میلانات کو ان گھناؤنے تصورات سے نجات نہیں دلائی جاتی جب تک جنسی تعلقات کو ان کا جائز مقام نہیں دیا جاتا۔ اُس وقت تک معاشرہ صحت مند نہیں ہو سکتا، اور نہ ہی عورت کو سطحِ انسانیت پر لایا اور عزت کی نگاہ سے دیکھا جا سکتا ہے۔ کیونکہ یہ حقیقت ہے کہ مرد نے آج تک محض اُن ہی عورتوں کی عزّت کی ہے جن سے کسی قسم کے جنسی تعلق کا تصوّر نہ ہو سکتا ہو ــــ مثلاً اس کی ماں، بیٹیاں یا بہنیں۔

برادران! یہ ہیں زندگی کے وہ ٹھوس اور ناخوشگوار حقائق، جن کا ہمیں آج سامنا کرنا ہے۔ انہیں کسی صورت میں بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ آج معاشرہ میں عورت کا عورت ہونا ہی اس کا سب سے بڑا جرم ہے۔ جس کا خمیازہ اُسے عمر بھر بھگتنا پڑتا ہے۔ ایک شودر کے لئے تو یہ امید ہو سکتی ہے کہ وہ چونتیس کروڑ بار جنم لے کر کسی برہمن کے گھر پیدا ہو جائے لیکن عورت کے لئے یہ ممکن نہیں کہ وہ اپنے آپ کو ان ذلّت آمیز تصوّرات کے جال سے آزاد کرے جو معاشرے نے اسکے گرد بُن رکھا ہے۔

عورت کے ان مسائل کا حل صرف قرآنی نظامِ معاشرت میں مل سکتا ہے۔ دنیا میں یہی ایک نظام ہے جو ہر فرد کو اس کی ضروریاتِ زندگی، بلامزد و معاوضہ، مہیا کرنے کی ذمہ داری لیتا ہے۔ اور اس طرح روٹی کا نوالہ دیکر جان مول لے لینے والے مفاد پرستوں کے ہاتھ باندھ کر رکھدیتا ہے۔ اس معاشرے میں ہر انسان کے طبعی تقاضے قانوناً پورے کئے جاتے ہیں۔ کسی سخی کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑے جاتے ــــ چنانچہ عورت کے لئے مستقبل میں اگر کوئی امید کی کرن نظر آسکتی ہے تو وہ نظامِ ربوبیت ہی کے قیام و دوام میں نظر آسکتی ہے۔ علاوہ ازیں، اسلام ہی وہ طرزِ زندگی ہے جو فرد کو توہمات کی تاریک دنیا سے نکال کر انسانیت کی سطح پر لا کھڑا کرتا ہے ــــ اور اس

(بقیہ صفحہ ۱۰۶ پر)

آزادی

پروفیسر اَحمد منظور (ایم۔ اے) گورنمنٹ کالج فار ومنز لاہور

صدرِ محترم - معزز خواتین و حضرات !

سب سے پہلے، میں اس بزم کا تہِ دل سے شکریہ ادا کرنا چاہتی ہوں جس نے بے زبانوں کو زبان دی۔ عورتوں کو بے زبان کہہ کر، برادران! میں ان کے باتونی ہونے سے انکار نہیں کرتی۔ "بے زبان" سے یہاں میرا مطلب اس گھریلو یا پالتو قسم کے جانور سے ہے۔ جو آپ سے یہ نہ پوچھ سکے کہ آپ نے اسے ایک کھونٹے سے کھول کر دوسرے کھونٹے سے کیوں باندھ دیا جو خود اپنے لئے فیصلے کرنے سے قاصر ہو، یا قاصر بنا دیا گیا ہو۔ وہ جس کی روح پر قید ہو، گفتار پر تعزیریں ہوں، جس کی فکر محبوس ہو اور جذبات پہ زنجیریں ہوں۔

عورت کی بے زبانی، برادرانِ عزیز! اُس بے زبان کی بے زبانی سے زیادہ قابلِ رحم رہی ہے جسے سپوتنک (SPUTNIK) میں بند کر کے فضا کی پہنائیوں میں بے یار و مددگار چھوڑ دیا گیا ہو۔ اُس بے زبان پر خود مختاری کی تہمت نہیں۔ لیکن عورت پر انسان ہونے کی جہت سے خود مختاری کی تہمت بھی ہے۔

برادرانِ عزیز! اقوامِ متحدہ کے اجلاس میں بیگم اکرام اللہ کا کھڑے ہو کر کشمیر کے مسئلہ پر دھواں دار تقریر کرنا تو اہلِ وطن کی سمجھ میں آ سکتا تھا، لیکن ایک عورت کا کسی ایسی مجلس میں بر سرِ منبر آنا جس میں خدا اور اس کی کتاب کا ذکر آتا ہو، اسی قدر ناقابلِ تصور سمجھا جاتا رہا ہے، جس قدر ایک مرد کا ایک ہی وقت میں دو یا تین بیویاں نہ رکھ سکنا۔ ایسا کیونکر ہوا برادران ؟ مذہب کی مچان لگا کر عورت کا شکار کیسے کھیلا گیا؟ یہ ابھی ابھی میری ایک بہن واضح کر چکی ہیں۔

آج تک تو کام بہت آسان تھا، برادرانِ عزیز! نہ فکرِ جہاں، نہ غمِ دوراں ــــ خود اپنے لئے بھی فیصلے کرنے کی زحمت کبھی نہ اٹھانی پڑی تھی۔ قفس کے گوشے کی عافیت اب بھی کبھی یاد آتی ہے تو عافیت پسند ذہن بساختہ پکار اٹھتا ہے

زندگی یوں بھی گذر ہی جاتی
کیوں ترا راہ گذر یاد آیا

"راہ گذر" کا یاد آنا، برادرانِ عزیز! تحریکِ طلوعِ اسلام میں قدم رکھنا تھا۔ شروع شروع میں جذبۂ محرکہ ــــ اگر آپ اسے حرکت کہہ سکتے ہیں ــــ بڑوں کے حکم کے تحت "خدا اور رسول" کا نام سُن کر "عاقبت سنوارنا" تھا۔ پھر آہستہ آہستہ برسوں کے بسائے ہوئے صنم خانے ویران ہونے لگے۔ بات سمجھ میں آنے لگی۔ اور آخرِ کار، دستورِ زبان بندی

بھی تہ ہو گیا۔ کچھ کہنے کی ضرورت محسوس ہونے لگی۔ انسانوں کے خود ساختہ قفس کی چلمن کی رنگین تیلیاں ایک ایک کرکے ٹوٹ چکی تھیں۔ خدا کی عطا کردہ لذتِ پرواز پھر ایک مرتبہ ہماری تھی۔ لیکن ساتھ ہی دیکھا تو ـــــ تیر بھی کمان میں تھا اور صیاد بھی کمیں میں ـــ میرا اشارہ، خواتین و حضرات! ان لامحدود ذمہ داریوں کی جانب ہے جو انسانیت کے مقام پر پہنچ کر آدمی پر عائد ہوتی ہیں۔ اس در دِ جگر کی طرف ہے، جو مقامِ بندگی پر پہنچ کر آدم کے حصے میں آتا ہے۔ ایک روسی مصنف کا کہنا ہے

"زندگی کے متعلق سوچنا خود زندگی سے کم دشوار نہیں"

لیکن برادران! مقامِ بندگی پر پہنچ کر، یہ محسوس کرنے میں دیر نہیں لگتی کہ یہی دشواریاں دراصل متاعِ حیات ہیں۔ جیسا کہ شاعرِ مشرق نے کہا ہے:-

متاعِ بے بہا ہے دردو سوزِ آرزو مندی
مقامِ بندگی دیگر، نہ لوں شانِ خداوندی

یہ دشواریاں، انسان کی آزادیٔ فکر و عمل کی پیدا کی ہوئی ہیں ـــ اور وہ شئے جس نے صبحِ ازل مقامِ آدم کو مقامِ فرشتہ سے افضل قرار دیا تھا، آزادیٔ فکر و عمل ہی تو تھی۔

یہاں پر میں، یہ ضروری سمجھتی ہوں کہ آزادی کے مفہوم کو ذرا وضاحت سے بیان کر دوں۔ جہاں تک عورتوں کا تعلق ہے، آزادی چند سطحی تبدیلیوں کا نام رکھ دیا گیا ہے۔ مغرب کی عورت کو آزاد کہا جاتا ہے محض اس لئے کہ وہ نوکری کر سکتی ہے، نیم عریاں لباس پہن سکتی ہے اور مردوں کے ساتھ رقص کر سکتی ہے۔ ایسا معاشرہ خواتین وحضرات! جو عورت کو اس بات پر مجبور کر دے کہ وہ زندگی بھر، مردوں کے معیارِ حُسن و دلفریبی پر پورا اُترنے کی کوشش کرتی رہے، آزاد معاشرہ نہیں۔ ایک انسان کا محض دوسرے انسان کی خوشنودی کی خاطر اپنی شخصیت کو کچل کر رکھ دینا، برادران! آزادی نہیں، آزادی کی تضحیک ہے۔ (LADIES FIRST) کے اصول کی ابتدا عورت کے مقام کو اونچا نہیں بلکہ نیچا ثابت کرنے کے لئے ہوئی تھی۔ یہ اخلاق نہیں، بلکہ جذبۂ رحم کا اظہار تھا۔ اور ان دونوں میں بہت فرق ہے۔

میں اپنے وطن کی ان مغرب زدہ خواتین کو بھی آزاد ماننے کیلئے تیار نہیں، جو معاشرہ کے ہر قسم کے قیود و ضوابط سے آزاد ہو چکی ہیں۔ درحقیقت یہ بھی بے زبان، گھریلو اور پالتو قسم کے جانور ہیں ـــــ رسّیاں تڑا کر بھاگے ہوئے بے زبان گھریلو اور پالتو جانور ـــــ ان کا رسّیاں تڑانا، ان کے شعور کی بیداری کی دلیل نہیں ـــــ یہ محض ردِ عمل ہے عورت کے اس بے جان تصوّر کے خلاف، جسے معاشرے نے اپنایا اور جسے مصورِ غم، علامہ راشد الخیری نے اپنی کتابوں میں پیش کیا۔ اور ردِ عمل، برادران! کسی غور و فکر کا نتیجہ نہیں ہوتا۔ اور نہ ہی یہ کسی قسم کے تعمیری نتائج پیدا کر سکتا ہے۔ لیکن مستقل اقدار کی غیر موجودگی میں اسے روکا بھی نہیں جا سکتا۔

آزادی، خواتین وحضرات! ایک قسم کی وضع قطع چھوڑ کر دوسری قسم کی وضع قطع اختیار کر لینے کا بھی نام نہیں آزادی قلب و دماغ کی ایک خاص کیفیت کا نام ہے۔ جناح نے انگریزی ٹوپی پہن کر انگریزوں کے خلاف آزادی کی جنگ لڑی، اور مولانا ابوالکلام آزاد نے شرعی وضع قطع میں اپنے ضمیر اور اپنی قوم کو زندہ رکھا۔

برادران! خلیل جبران کی نظموں کا مطالعہ۔ ڈی۔ ایچ۔ لارنس میں دلچسپی۔ فرائیڈ کے نظریۂ جنسیات پر بحث و تمحیص کسی کو "جدت پسند" تو کہلوا سکتی ہے لیکن اس کی آزادی کی دلیل نہیں بن سکتی۔ آزادی برادران! رسیاں تڑا کر بھاگ جانے کا نام نہیں۔ آزادی، کھونٹے اور رسی کی مدد کے بغیر اپنے مقام کو پہچان سکنے اور اس سے وابستہ رہنے کی صلاحیت کا نام ہے۔

خواتین وحضرات! یہ نفسیات کا اصول ہے کہ اگر کسی شخص کے کان میں بار بار یہ دُھرایا جائے کہ تم پاگل ہو، تم سودائی ہو تو ایک وقت ایسا آجاتا ہے جب وہ واقعی اپنا توازن کھو بیٹھتا ہے اور اپنے آپ کو پاگل اور سودائی سمجھنے لگتا ہے۔ اس سے پاگلوں اور سودائیوں کی سی حرکتیں بھی سرزد ہونے لگتی ہیں۔ اسی قسم کا مذاق کچھ عورت کے ساتھ کیا گیا۔ سرِ راہ، بار بار، اُسے رنگین کھلونا کہہ کر پکارا گیا۔ پھر وہ وقت آیا، جب وہ واقعی اپنے آپ کو رنگین کھلونا سمجھنے لگی۔ اس سے برادران! شاید ہمسفروں کے احساسِ ملکیت کی تو کچھ تسکین ہو گئی ہو لیکن انسانیت کے ارتقاء کی راہیں اُلجھ کر رہ گئیں۔ وہ سکون جو عورت کی محکومی اور بے زبانی سے گھر میں حاصل ہو در اصل سکون نہیں، برادرانِ عزیز! جمود ہے۔

دور کیوں جائیے، اسی محفل سے متعلق ایک واقعہ مجھے اب تک یاد ہے۔ غالباً دو سال ہوئے، انہی اجلاس میں ایک صاحب نے شرکت کی۔ واپس گھر پہنچے تو تقریروں کا اثر ابھی تازہ تھا۔ رفیقۂ حیات سے تبادلۂ خیالات کی ضرورت محسوس ہوئی۔ پاس بیٹھ کر فرمانے لگے:۔

"آج چوہدری صاحب نے اپنی زندگی کے بڑے عجیب و غریب واقعات سنائے۔ کہتے تھے ......"

بیوی نے ایک لمحہ کے لئے ان کی طرف دیکھا اور پھر بڑے اطمینان سے فرمایا:۔ "آپ کی اس قمیص کا کپڑا بڑا اچھا رہا"

بیچارے کچھ جھینپ سے گئے۔ بہرحال سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا:۔ "چوہدری صاحب نے کہا ......"

بیوی نے پھر نظریں اوپر کو اٹھائیں اور مسکرا کر کہا:۔ "دو مرتبہ دُھل چکی ہے لیکن اس کے رنگ میں ذرہ برابر فرق نہیں آیا۔"

شوہر بھی آسانی سے ہار ماننے والے نہیں تھے۔ تیسری مرتبہ پھر ڈھٹائی سے بولے:۔ "چوہدری صاحب فرماتے تھے ..."

بیوی نے پھر متبسم نگاہیں شوہر کی طرف اٹھائیں ـــــ

برادرانِ عزیز! یہ کسی ناخواندہ خاتون کا ذکر نہیں۔ موجودہ زمانے کی اصطلاح میں انہیں اعلیٰ تعلیم یافتہ کہا

جائے گا۔ ان کی ذہانت کے چرچے اب تک ہیں ـــــ، تو انھوں نے برادران! پھر متبسّم نگاہیں شوہر کی طرف اٹھائیں اور کہا:۔ " دونوں مرتبہ میں نے اسے گھر ہی میں دھو کر استری کیا ہے"۔ شوہر کی ہمت جواب دے گئی۔ بٹے ہوئے "بچارئیے" کی طرح سر جھکائے باہر چلے گئے۔ اس وقت انہیں کون یہ بتاتا کہ

زخموں پہ دل کے آج یہ حیران ہو نا کیا
قبلہ یہ گُل کھِلائے ہوئے آپ ہی کے ہیں

یہ ہیں وہ بے زبان رنگین کھلونے، برادران! جو صرف اپنا ہی مقام نہیں کھو بیٹھے، بلکہ آپ کو بھی آپ کی منزل سے دُور لئے جا رہے ہیں۔ یہ ہیں، وہ بے حس پتھر جنھیں آپ ہی نے کناروں پہ جمع کر کے اپنی وسعتوں کو محدود کر لیا ہے۔ ساحل کے وہ بے حس پتھر، جن سے ہر آنے والی موج اپنا سر پھوڑ کر واپس لوٹ جاتی ہے۔ یہ ہے وہ موت کا سکون جو زندگی کے ہر ولولے کو اپنے اندر جذب کر لیتا ہے۔ اور جسے بد قسمتی سے آپ حاصلِ زندگی سمجھے ہوئے ہیں۔

ان پتھروں کو، برادران! طوفانوں سے آشنا کر دیجئے۔ اس سکوت کو سوز و سازِ زندگی سے ہم آہنگ کر دیجئے۔ ان بے زبان رنگین کھلونوں کو ان کی شخصیت لوٹا دیجئے۔ ان کی آزادیٔ فکر و عمل لوٹا دیجئے۔ ان کا مقام بندگی لوٹا دیجئے موت دی ہے تو مسیحائی میں بھی ہاتھ بٹائیے۔ قرآن کی مستقل اقدار کی رُو سے یہ ان کا حق ہے، آپ کی نوازش نہ ہو گی۔

ختم کرنے سے پہلے میں یہ کہنا چاہتی ہوں کہ عورت کی محکومی کو مرد کی آزادی سمجھنا غلطی ہے۔ کرگسوں میں پلنے والے فریب خوردہ شاہیں رہ و رسمِ شاہبازی سے واقف نہیں ہو سکتے۔ قرآن جب بنی نوعِ آدم کو واجب التکریم بتاتا ہے، تو اس میں مرد اور عورت دونوں شامل ہوتے ہیں۔ نصفِ آدمیّت کو قابلِ حقارت سمجھنا، باقی نصف کو واجب العزّت نہیں بنا سکتا ـــــ ایک آنکھ دکھتی ہو تو دُوسری آنکھ کبھی چین سے نہیں سو سکتی۔ یہ فطرت کا اٹل قانون ہے۔ خوش عقیدگی کی اسپارین سے، درد کا احساس تو گم ہو سکتا ہے، مرض نہیں جایا کرتا ـــــ اور اگر اس افیونی عمل کو ایک عرصہ تک جاری رکھا جائے تو وہ زخم ایک دن ناسُور بن جاتا ہے ـــــ قرآن کے نسخے سے، اس زخم کا علاج کیجئے، قبل اس کے کہ یہ زخم ناسور بن جائے۔ یاد رکھئے۔ عورت کی قرآنی آزادی، مرد کی حقیقی آزادی کی ضامن ہے۔ اس سے ڈریئے نہیں ـــــ والسّلام۔

معاشرہ میں عورت کا مقام

محترمہ ثریا عندلیب — بیگم حبیب اللہ خان صاحبہ۔ میو گارڈن۔ لاہور

خواہران و برادرانِ عزیز! السّلام علیکم۔

طلوعِ اسلام کے اس سالانہ کنونشن کے مبارک موقعہ پر ہم طاہرہ بہنوں اور بیٹیوں کو پہلی دفعہ اظہارِ خیال کرنے کی جو سعادت، ہمارے داعیِ انقلاب اور مفکرِ قرآن، جناب پرویز صاحب نے مرحمت فرمائی ہے، اس کے لئے ہم تہِ دل سے ان کی شکر گذار ہیں۔ ہمارے لئے یہ اسقدر سچی خوشی اور روحانی مسرت کا مقام ہے کہ جو محتاجِ بیان نہیں۔

اس قرآنی فضا میں جہاں قرآنی رشتے میں منسلک، ہم فکر و ہم خیال احباب اکٹھے ہوئے ہیں، وہاں ان سلیم بھائیوں کے ساتھ ساتھ طاہرہ بہنوں کا یہ پاکیزہ اجتماع، یقیناً ہمارے حال و مستقبل کو ایک پیامِ نو دے رہا ہے۔ ان گزرتے ہوئے لمحات کے ساتھ آنے والی ساعتیں انشاء اللہ اس کی گواہی دیں گی۔

اس تقریبِ سعید پر جہاں اور بہت سے مسائلِ حیات پر قرآنی اصولوں کے ماتحت غور و فکر کیا جائے گا، وہاں قوم کی طاہرہ بیٹیوں پر یہ واضح ہوجانا بھی ضروری ہے کہ خالقِ حقیقی نے انھیں انسانیت کے کس درجے پر فائز کیا ہے اور انھیں کیسا مقامِ بلند عطا ہوا ہے۔ قرآن نے ان کے ذمہ کون سے فرائض عائد کئے ہیں، اور اُن کو کیا حقوق دیئے ہیں، جن سے ان کو زندگی کی خوشگواریاں اور شادابیاں ملتی ہیں، اور اطمینان و سکون کی نعمتیں حاصل ہوتی ہیں۔

سب سے پہلے، ہر طاہرہ بیٹی کو یہ اچھی طرح سمجھ لینا چاہیئے کہ اس کائنات میں عورت کا اپنا مقام ہے۔ اگر وہ اپنا مقام چھوڑ کر، مرد کا مقام حاصل کرنے کی خواہاں ہے تو اُس کے لئے یہ امر باعثِ فخر نہیں۔ ہمارے اِس دَور میں، عورتوں کے دل میں، غیر شعوری طور پر، یہ خیال پیدا ہوگیا ہے کہ دنیا میں عورت ہونا ذلیل ہونا ہے۔ یہ خیال، ایک ایسی نفسیاتی کشمکش میں ڈالدیتا ہے کہ جس کے نتیجے میں عورت مرد بننے کے جاؤ میں، اپنا حقیقی و برتر مقام کھودیتی ہے اور دوسری طرف سے اُسے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ اللہ تعالیٰ نے مَرد اور عورت کے مقام میں کوئی فرق نہیں رکھا۔ مرد اور عورت ایک ہی اصل کی شاخیں ہیں۔ اس لئے پیدائش کے اعتبار سے ان میں ایک کو دوسرے پر کوئی فضیلت نہیں۔ هُوَ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّجَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا (۷/۱۸۹) " اللہ وہ ہے جس نے تم سب کو نفسِ واحدہ سے پیدا کیا اور ان سے اس کے جوڑے بنائے " دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے۔ مرد اور عورت ایک دوسرے کے جزو ہیں۔ بَعْضُكُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ (۳/۱۹۴) " تم سب (مرد و عورت) ایکدوسرے میں سے ہو"۔ تقسیمِ عمل کے ضمن میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ بعض خصوصیات

مَردوں میں ایسی ہیں جو عورتوں میں نہیں اور بعض خصوصیات عورتوں میں ایسی ہیں جو مَردوں میں نہیں۔ ان خصوصیات کے اعتبار سے مَردوں کو عورتوں پر، اور عورتوں کو مَردوں پر فضیلت حاصل ہے۔ فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ (۴/۳۴) "اللہ نے (مَردوں اور عورتوں میں) ایک کو دوسرے پر فضیلت دی ہے"۔

دراصل عورت کو مَرد کا زیرِ دست اُس وقت سمجھا گیا، جب معاشرہ میں ذاتی مِلکیّت کا خیال پیدا ہوا، اور مَرد نے اپنے آپ کو پرائیویٹ پراپرٹی کا مالک بنالیا۔ یوں اقتصادی طَور پر، عورت کو مَرد کا محتاج سمجھ لیا گیا۔ مگر قرآن نے مَرد کی اس بالادستی کو بھی اس فرمان کے ساتھ ختم کر دیا کہ لِلرِّجَالِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوْا ؕ وَلِلنِّسَآءِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ ؕ (۴/۳۲) "مرد جو کچھ کمائیں وہ اُن کا حصّہ ہے، اور عورتیں جو کمائیں وہ ان کا حصّہ ہے"۔ اعمال کے لحاظ سے مرد و عورت میں کوئی تخصیص نہیں۔ ہر ایک اپنے عمل کا بدلہ پائے گا۔ اَنِّىْ لَاۤ اُضِيْعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى (۳/۱۹۴) "تم سے کوئی، مرد ہو یا عورت، میں کسی کے عمل کو ضائع نہیں کروں گا"۔ عیسائیت کے چور دروازوں سے داخل ہو کر یہ ایک عام عقیدہ مسلمانوں میں بھی مروّج ہے کہ جنّت میں امّاں حوّا شیطان کے چکمے میں آگئی تھیں، اور انھوں نے بادا آدم کو بہکایا۔ حالانکہ قرآن نے صاف الفاظ میں یہ کہا ہے کہ فَاَزَلَّهُمَا الشَّيْطٰنُ یعنی شیطان نے ان دونوں کو پھسلا دیا۔ چنانچہ قرآن کی اس وضاحت کے بعد، یہ سمجھنا صریحاً غلط ہے کہ گناہ کی ابتدا عورت سے ہوئی ہے اور وہی مَرد کی لغزشوں کی ذمّہ دار ہے۔ برعکس اس کے لغزش کا امکان دونوں میں ہے اور ایک کی ذمّہ داری دوسرے پر عائد نہیں ہوتی۔ مرد و عورت کے باہمی تنازعہ میں دونوں کی حیثیت یکساں رکھّی گئی ہے۔ سورۂ نور کی ابتدائی آیات اس کی وضاحت کرتی ہیں۔

خدا تعالیٰ نے جو خصوصیات مؤمن مَردوں کی بیان کی ہیں، وہی خصوصیات مؤمن عورتوں کے لئے رکھّی ہیں۔ قرآن کی رُو سے انسانیت کی تمام صلاحیتیں مَردوں اور عورتوں میں موجود ہیں۔ ان صلاحیتوں کی نشوونما اور ان کا صحیح و درست استعمال ہی زندگی کا نصب العین ہے۔ لہٰذا اس باب میں مَردوں اور عورتوں میں کوئی فرق نہیں۔ ان میں سے کسی صِنف کو دوسری صِنف پر کوئی فوقیت نہیں۔ دونوں جنّت میں داخل ہونے کا حق و اہلیت رکھتے ہیں۔ قرآنِ کریم کی یہ آیاتِ بیّنات سامنے رکھئے اور دیکھئے کہ ان میں مرد و عورت کو کس طرح ایک دوسرے کے دوش بدوش رکھّا گیا ہے۔ اِنَّ الْمُسْلِمِيْنَ وَالْمُسْلِمٰتِ یعنی اگر مرد یہ صلاحیت رکھتے ہیں کہ قانونِ خداوندی کی اطاعت سے اپنی ذات کی تکمیل کریں تو عورتیں بھی اس سے بے بہرہ نہیں۔ مُؤْمِنِيْنَ اور مُؤْمِنَات۔ اگر مرد اس جماعت کے رکن بن سکتے ہیں جو خدا کے قانون کے اٹل نتائج پر یقین رکھتے ہوئے امنِ عالم کی ذمّہ دار ہو تو عورتیں بھی اس جماعت کی اسی طرح رکن ہو سکتی ہیں۔ قَانِتِيْنَ اور قٰنِتٰتٌ۔ اگر مَردوں میں یہ صلاحیّت موجود ہے کہ وہ اپنی استعداد کی حفاظت کرتے ہوئے اسے صرف قانونِ خداوندی کے مطابق استعمال میں لائیں، تو عورتیں بھی ایسا کر سکتی ہیں۔ اَلصّٰدِقِيْنَ وَالصّٰدِقٰتِ

اگر مرد اپنے اعمال سے اپنے دعوٰیِ ایمان کی صداقت دکھاتے ہیں۔ تو عورتیں بھی اس میں ان کے ساتھ شریک ہیں
صَابِرِیْنَ اور صَابِرَاتِ ،۔ اگر مرد ثابت قدمی اختیار کرتے ہیں تو عورتیں بھی ثابت قدم ہو سکتی ہیں۔ اَلْخَاشِعِیْنَ اور
اَلْخَاشِعَاتِ ،۔ اگر مردوں کی یہ خوبی ہے کہ جیسے جیسے ان کی صلاحیتیں بڑھتی جائیں، وہ شاخِ ثمردار کی طرح قانونِ الٰہی کی
اطاعت میں اور جھکتے چلے جائیں تو عورتیں بھی اپنے اندر یہ وصف رکھتی ہیں۔ مُتَصَدِّقِیْنَ اور مُتَصَدِّقَاتِ :۔ اگر مرد
ایثار کر سکتے ہیں تو عورتیں بھی کر سکتی ہیں۔ اَلصَّائِمِیْنَ وَ الصَّائِمَاتِ :۔ اگر مرد اپنے اوپر یہ قابو رکھ سکتے ہیں کہ جب
سے انھیں روکا جائے رُک جائیں تو عورتوں میں بھی یہ حوصلہ ہوتا ہے۔ حَافِظِیْنَ اور حَافِظَاتِ :۔ اگر مرد اپنے جنسی
میلانات کو ضوابط کی پابندی میں رکھتے ہیں تو عورتیں بھی اس سے بے بہرہ نہیں۔ اَلذَّاکِرِیْنَ وَالذَّاکِرَات
اگر مرد قانونِ خداوندی کو شعوری طور پر سمجھنے اور ہر وقت اسے پیشِ نظر رکھنے کا ثبوت دیتے ہیں تو عورتیں بھی اس کی اہل ہیں۔
جب یہ صلاحیتیں دونوں میں پائی جاتی ہیں تو ان کے نتائج بھی دونوں کے لئے ایک جیسے ہونے چاہئیں۔ قرآن کے
نظامِ خداوندی میں دونوں کے لئے حفاظت کا سامان اور اجرِ عظیم موجود ہے۔ اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ مَّغْفِرَةً
اَجْرًا عَظِیْمًا۔ قرآن نے یہ اعلانِ عظیم آج سے ڈیڑھ ہزار سال پہلے کیا تھا کہ وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِیْ عَلَیْهِنَّ
بِالْمَعْرُوْفِ۔ قاعدہ اور قانون کی رُو سے عورتوں کے حقوق بھی اتنے ہی ہیں جتنے ان کے فرائض ہیں۔ اس لئے قانون
کی نگاہ میں مرد و عورت دونوں کو مساوی درجہ حاصل ہے۔ قرآنِ پاک کی یہ آیت وَلَقَدْ کَرَّمْنَا بَنِیْٓ اٰدَمَ
مرد اور عورت دونوں کا واجب التکریم ہونا ثابت کرتی ہے۔ آیت کا مطلب ہے ہم نے بنی آدم کو واجب التکریم بنایا
ہے۔ اس سے مراد، صرف مرد نہیں۔ مرد اور عورت دونوں ہیں۔ عربی زبان کے قاعدے کے مطابق مرد و عورت
مشترکہ ذکر کو بنو فلاں کہا جاتا ہے۔ ان میں بنی اسرائیل سے مراد، قومِ بنی اسرائیل کے صرف مرد ہی نہیں، مرد اور عورت
سب ہیں۔ اسی طرح، جب قرآن یہ کہتا ہے کہ ہم نے انسان کو فِیْٓ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ پیدا کیا ہے تو اس میں مرد اور عورت
دونوں شامل ہوتے ہیں۔ قرآن انسان کو خطاب کرتا ہے، صرف مردوں کو نہیں۔

قرآن نے جہاں مرد اور عورت کو زوج کہا ہے تو عورت کو مرد کی زوج نہیں کہا، بلکہ انسانوں سے مخاطب ہو کر کہا
ہے جَعَلَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا۔ "اس نے تم میں سے تمہارے لئے زوج بنا دیئے"۔ زوج
اور ساتھی کو کہتے ہیں۔ یعنی مرد اور عورت، ایک دوسرے کے رفیق اور ساتھی ہیں۔ ان میں سے ایک بالا دست نہیں اور
دوسرا زیر دست نہیں۔ بلکہ مرد کی تکمیل عورت سے، اور عورت کی تکمیل مرد سے ہوتی ہے۔ مرد و عورت کے اسی تعلق
کو قرآن نے دوسری جگہ لباس سے تشبیہ دی ہے۔ جہاں فرمایا کہ هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَ اَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ
"تم ایک دوسرے کے لئے بمنزلہ لباس کے ہو، جو بدن کے ساتھ پوری طرح موافقت رکھتا ہے"۔ مرد و عورت کی
باہمی رفاقت سے ایک دوسرے کی صلاحیتیں نشوونما پاتی اور توازن پذیر ہوتی ہیں۔ لہٰذا مرد کا یہ سمجھنا کہ میں عورت

ے افضل ہوں، محض اپنے آپ کو فریب دینا ہے اور جس کی اللہ کے نزدیک کوئی حقیقت نہیں۔

اب فرائض اور ذمّہ داریوں کی طرف نظر ڈالیئے۔ اس جگہ مرد اور عورت کے راستے علیحدہ ہو جاتے ہیں۔ زندگی کے ان گوشوں میں مرد اور عورت کی خصوصیات یکساں ہیں۔ مثلاً عقل و بصیرت کی خصوصیّت، وہاں یہ دونوں ایک دوسرے کے ہمراہ ہوں گے۔ مگر قدرت نے ان کے فطری وظائفِ زندگی میں جو فرق رکھا ہے، اُسے فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ فطری تقسیمِ کار کی رُو سے، عورت کے ذمّہ اولاد کی پیدائش، پرورش اور ابتدائی تربیت ہے۔ ان فرائض کی ادائیگی میں اس کا بیشتر وقت اور توانائی صَرف ہو جاتی ہے اور اس دوران میں وہ طبعی طور پر اس قابل نہیں ہوتی کہ زندگی کے سخت محنت و مشقّت والے شعبوں میں حصّہ لے سکے۔ اس سے معاشرہ میں جو کمی پیدا ہوتی ہے، اُس کو مَرد پُورا کرتا ہے، کیونکہ اس کے سامنے کوئی ایسی رکاوٹیں نہیں ہوتیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس مقام پر اللہ تعالیٰ نے اَلرِّجَال کو اَلنِّسَآءِ پر قَوَّامُوْنَ بنایا ہے۔ یعنی عورتوں کی روزی مہیا کرنے والے۔ ظاہر ہے کہ یہ چیز مرد کو عورت کے مقابلہ میں اونچا نہیں کرتی۔ برعکس اس کے عورت اس کی کمی کو پُورا کرتی ہے وہ عورت کی اس کمی کو پُورا کرتا ہے۔ عورت ایک نوعیت سے معاشرہ میں اضافہ کا سبب بنتی ہے، مَرد دوسری نوعیت سے۔ ایک کو ایک لحاظ سے شرف حاصل ہے، دوسرے کو دوسری وجہ سے۔ تقسیمِ کار کا یہ بیش بہا کائناتی اصول ہے، جو ایسا معاشرہ تشکیل دیتا ہے، جس کے بعد عورت کے دل میں کبھی یہ خیال پیدا نہیں ہو سکتا کہ میں عورت کیوں بن گئی۔ مرد کیوں نہ بنی۔ مسلم خاتون کو، آج کی طاہرہ بیٹی کو، ہمیشہ یہ حقیقت پیشِ نظر رکھنی چاہیئے کہ مرد بننے کی ہوسِ خام میں اپنے بلند مقام کو کھو دینا سَراسَر گھاٹے کا سودا ہے۔ قرآن نے اسی لیئے کہا تھا وَلَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللّٰهُ بِهٖ بَعْضَكُمْ عَلٰی بَعْضٍ۔ "جو خوبیاں ہم نے ایک نوع کو دی ہیں۔ دوسری نوع کو کبھی نہیں چاہیئے کہ ان کی تمنّا میں اپنے مقامِ افضلیت کو ضائع کر دے۔" مرد کی برتری مَرد رہتے ہوئے اور عورت کی برتری عورت رہنے میں پنہاں ہے۔ مرد و عورت کے سعی و عمل کے میدان الگ الگ ہیں۔ اپنے اپنے میدان میں اپنے اپنے تفویض شدہ فرائض و ذمّہ داری پوری محنت اور حسن و خوبی سے سَرانجام دینے میں ہی معاشرہ کی بہبودی اور بھلائی ہے۔

عورت اور مرد کے فرائض میں جو فرق ہے، اس کے لیئے ان دونوں کی ساخت میں حیاتیاتی اختلاف ہے۔ اسی اختلاف کی وجہ سے عورت کی زندگی کا ایک حصّہ بچّوں کی پیدائش و پرورش کی ذمّہ داریوں کو نبھانے میں گزرتا ہے۔ جس کی وجہ سے وہ دوسرے ایسے عملی کاموں میں شریک نہیں ہو سکتی جنھیں عام طور پر مَرد کرتے ہیں۔ مگر یہ معذوری عورت کا درجہ مرد کے مقابلہ میں کم نہیں کر دیتی، بلکہ اس اعتبار سے تو عورت کا مقام مَرد کے مقابلہ میں برتر ہے، کیونکہ اگر وہ چاہے تو اپنے ان فرائض کو سَرانجام دیتے ہوئے ہر وہ کام کر سکتی ہے جسے مرد کرتے ہیں۔ لیکن مرد ہزار چاہنے کے باوجود اُن امور کو سَرانجام نہیں دے سکتا جنھیں عورت کی معذوریاں سرانجام دیتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ اگر عورتیں مَردوں کی ذمّہ داریاں

سنبھال لیں، اور اپنے فرائض سے منہ موڑ لیں تو اُن کے فرائض کی تکمیل کون کریگا؟ مَردوں کو تو ان فرائض کو ادا کرنے کی اہلیت ہی نہیں دی گئی۔ اس کے بعد فطرت کا یہ پروگرام تہ و بالا نہیں ہو جائے گا کیا؟

اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ شجرِ انسانیت کی بالیدگی اور نسلِ انسانی کی زندگی عورت کے دَم سے ہی قائم ہے۔ پھر اگر کوئی طاہرہ بیٹی اپنی اس خصوصیت سے اظہارِ نفرت کرتی ہے، اور اپنی ان اعلیٰ ذمہ داریوں کو، اپنے لئے باعثِ شرم سمجھتی ہے تو اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ فطرت کے نقشے میں بگاڑ کا سبب بنتی ہے۔ اور یوں وہ اپنے آپ کو اس اطمینان سے بھی محروم کر لیتی ہے جو اسے فطرت کے متعیّن کردہ فرائض کی ادائیگی سے حاصل ہوتا ہے۔

ایک عورت، عورت ہوتے ہوئے ہزار عزّتوں کی مستحق، اور لاکھ عظمتوں کی سزاوار ہے۔ اگر اسے اپنے عورت ہونے پر عار ہے تو اس کی زندگی بیکار ہے۔ اور یہ صرف اس کی انتہائی بدقسمتی نہیں بلکہ پُوری نوعِ انسانی کی شوریدہ بختی ہوگی۔ انسانیت کی تشکیل میں گھر بڑی بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ اور تعلّقاتِ انسانی میں خاندان کا بڑا دخل ہے جو معاشرہ، اس اساس و بنیاد کو قائم نہیں رکھتا (جس کی مثال یورپ اور روس ہیں) وہ آئندہ نسلوں کو آوارہ و بے مرکز بنا دیتا ہے۔ گھر اور خاندان کو بنانے اور سنوارنے میں عورت کی حیثیت مرکزی ہے۔ عورت ہی گھر کو جنّت بنا سکتی ہے آنے والی نسلوں کو باوقار انسان بنانے میں عورت کا بڑا حصّہ ہے۔ اگر عورت اپنے اس اہم اور قابلِ فخر فریضہ کو چھوڑ کر مَردوں کے فرائض کی طرف رجوع کرتی ہے تو وہ نہ صرف اپنے آپ پر، بلکہ معاشرہ اور انسانیت پر ظلم کرتی ہے۔ بلاشبہ عورت، مَردوں کے ساتھ ساتھ جہادِ زندگی کے دوسرے شعبوں میں شریک ہو سکتی ہے۔ مگر اس صُورت میں کہ پہلے اپنے اوّلین فرائض کی تکمیل کرے۔

دیکھئے! عورت کی اس عظمت کو قرآنِ کریم نے جس طرح اجاگر کیا ہے، اُس کی ہمارے رہنما حکیم الامت علامہ اقبالؒ نے کس عمدگی سے ترجمانی کی ہے

جہاں را محکمی از امّہات است　　نہادِ شاں امینِ ممکنات است
اگر این نکتہ را قومے نداند　　نظامِ کاروبارش بے ثبات است

آخر میں، اپنی طاہرہ بہنوں سے، یہ میری استدعا ہے کہ وہ اپنے نظامِ حیات کو وحیِ خداوندی کے تابع رکھکر مسلمان عورت کا ایسا نمونہ پیش کریں کہ جس سے دوسری راہ گم کردہ بہنوں کی جامد ذہنیتوں میں ایسا انقلاب بپا ہو، جو انھیں کشاں کشاں قرآن کی طرف لے آئے اور یوں یہ پُوری زمین، اپنے نشو و نما دینے والے کے نور سے جگمگا اُٹھے۔ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ۔

بچّوں کی تربیّت وتعلیم کی اہمیّت

مُحترمہ سکندرہ، بیگم ڈاکٹر ریاض صاحب۔ گلبرگ۔ لاہور

تاریخ انسانی کے کسی دَور کو لیجئے، ہر قوم کی ترقی کا دارومدار، اس کی نئی نسل کے نظریاتِ زندگی اور تعمیری خیالات پر رہا ہے ایک بچّہ، صرف اپنے ماں باپ کا نہیں، بلکہ پُوری قوم کا سرمایہ ہے ــــ قیمتی سرمایہ ــــ ایسا سرمایہ کہ اگر اس کی حفاظت نہ کی جائے، اور اُسے اس قابل نہ بنایا جائے کہ وہ اپنی قوم کا اچّھا فرد بنے، اُس کے وقار کو قائم رکھے اور اس کی ترقی وخوشحالی میں اضافہ کرے، تو آہستہ آہستہ وہ قوم اپنی خداداد صلاحیتوں سے محروم ہو جاتی ہے۔ قیمتی سرمایہ میں کمی، قوم کو جو نقصان پہنچاتی ہے وہ صدیوں میں جاکر اپنا اثر دکھاتا ہے۔ اور ذمّہ داری اس کی والدین اور استاد دونوں پر عائد ہوتی ہے۔

تمام بچّے قوانینِ فطرت کے تحت اس دنیا میں آتے ہیں۔ کوئی ماں یہ نہیں جان سکتی کہ ہر آن رحمِ مادر میں کس طرح اُن کی پرورش ہوتی ہے۔ اور نہ کسی ماں کو، ان کی اُس وقت کی پرورش میں کوئی دخل ہوتا ہے۔ ماں کے فرائض اور اس کی ذمّہ داریاں، ظاہری طور پر اُس وقت شروع ہوتی ہیں۔ جب بچّہ اس دنیا میں آجاتا ہے۔ ویسے تو اب سائنسی ترقی کا دور ہے اور ہمارے سائنسدان یہ بھی ثابت کرتے ہیں کہ بچّہ کی پیدائش سے قبل بھی ماں کی ذہنی کیفیات کا اثر بچّے پر پڑتا ہے۔ اور ماں کے اس زمانہ کے عادات وخصائل بھی اس کی زندگی پر اثر انداز ہوتے ہیں۔

بچّے کی پرورش اور تربیت دو مختلف چیزیں ہیں۔ پرورشِ جسمانی بھی اُسی قدر لازمی ہے جس قدر کہ تربیتِ ذہنی۔ تندرست وتوانا بچّے، نہ صرف ماں باپ کے لئے باعثِ رحمت ہیں، بلکہ پُوری قوم کے لئے سامانِ نعمت ہیں۔ ایک محاورہ ہے، کہ "ایک تندرست جسم میں ہی ایک تندرست دماغ تربیت پاتا ہے۔" چھوٹے بچّوں کی جسمانی پرورش کے لیے بھی ہر ماں کو اصول و قواعد جاننے لازمی ہیں، اور ساتھ ہی ان کی ذہنی نشو ونما کے طریقوں سے بھی واقفیت ہونی چاہیئے۔

(۱)۔ بچّوں کی تربیت کے سلسلہ میں تمام والدین کو یہ امر بخوبی ذہن نشین کر لینا چاہیئے اور اس حقیقت کو ہر وقت یاد رکھنا چاہیئے کہ بچّے قدرت کا بہترین عطیہ، قوم کا قیمتی سرمایہ، اور اللہ تبارک وتعالیٰ کی مقدّس امانت ہیں۔ والدین کی حیثیت صرف ایک امین اور خدمتگذار کی ہے۔ ہر ماں اور ہر باپ کو بارگاہِ الٰہی میں جواب دہی کرنی پڑے گی کہ جو امانت ان کے سپرد کی گئی تھی انھوں نے اس کی حفاظت اور تربیتِ روحانی وجسمانی کے لئے کیا کچھ کیا؟

(۲)۔ ہر بچّہ، قدرت کی طرف سے خوابیدہ صلاحیتیں لئے ہوئے اس جہاں میں آتا ہے۔ اور جب تک اُن صلاحیتوں کی صحیح نشو ونما نہ ہو، اُس کی شخصیّت نامکمّل رہتی ہے۔ والدین کے پیشِ نظر دوسرا نکتہ یہ ہونا چاہیئے کہ وہ اپنی ذہنی سطح کے

مطابق پُوری پُوری کوشش کریں کہ ان کا بچّہ، وہ کچھ بن جائے جس کے بننے کی صلاحیت قدرت نے اُسے عطا کی
انہیں بچّہ پر اس کے رجحانات کے خلاف زبردستی نہیں کرنی چاہیئے۔ بلکہ مشفق، ناصح اور ہمدرد و رہبر ہونا چاہیئے۔
نگران اور سخت گیر مختارِ کل بن کر وہ اپنی راہ میں مزید دشواریاں خود پیدا کر لیتے ہیں۔

(۳)۔ ہر بچّہ کی اپنی اپنی پسند ہوتی ہے اور اپنا جدا معیار اور پیمانہ۔ اس کا لحاظ بھی رکھنا ضروری ہے۔ اپنی ذا
پسند، اپنے معیار، اپنے پیمانوں سے بچّوں پر تسلّط قائم کرنا نادانی ہے۔

(۴)۔ ہر بچّہ میں عزّتِ نفس کا جذبہ ہوتا ہے۔ چاہے وہ ظاہر ہو یا پوشیدہ۔ جس طرح ہمیں اپنی بے عزّتی کا رنج
اور افسوس ہوتا ہے، اسی طرح بچّہ بھی یہ جذبات رکھتا ہے۔ اور چونکہ اس کا پیمانہ، اس کی عمر اور ذہنی سطح کے مطابق
ہوتا ہے۔ اس لئے وہ ہم سے بھی زیادہ محسوس کرتا ہے۔ بلکہ بسا اوقات زیادہ حسّاس بچّوں کی پُوری زندگی اُن کے
بچپن کے حادثات اور واقعات کا شکار ہو کر رہ جاتی ہے۔

(۵)۔ بچّوں کی مثال نازک نگینوں اور صدف کے اندر پوشیدہ موتیوں کی طرح ہے۔ جوہری اپنی پُوری کاریگری
سے نگینے جڑتا اور موتی صاف کرتا ہے۔ اس نازک کام کو وہ کسی دوسرے نااہل کے سپرد نہیں کرتا۔ وہ جانتا ہے کہ اگر نگی
یا موتی کو نقصان پہنچا تو وہ اپنی قیمت کھو دیں گے۔ بس اچھی طرح سمجھ لیجیئے کہ اگر ہم بچّے کی صحیح تعلیم و تربیت نہیں کرت
اس میں کوئی خامی رہ جاتی ہے تو اپنے قیمتی سرمایہ کو ضائع کرنے کی ذمّہ داری ہم ہی پر آتی ہے۔

بچّوں سے محبّت، ماں کا پہلا فرض ہے۔ لیکن ایک حد کے اندر۔ پانی اور آگ، بجلی اور ہوا، تمام کائناتی قوتوں کی
مثال ہمارے سامنے ہے کہ کس طرح ایک مخصوص و معیّن حد کے اندر، ایک خاص طریقے اور ضابطے کے ساتھ یہ قوتیں
ہمارے لئے رحمت و برکت کا باعث بنتی ہیں۔ اور کس طرح اگر حد اور ضابطہ کو توڑ دیا جائے تو یہ ہماری تباہی کا باعث
بن جاتی ہیں۔ درمیان کی راہ ہمیشہ بہتر ہوتی ہے۔ بیجا لاڈ اور پیار بھی بچّہ کو تباہ کر دیتا ہے اور بیجا سختی بھی۔ ہر وقت
کی ڈانٹ ڈپٹ، روک ٹوک بھی اُس کی شخصیت کو اُبھرنے نہیں دیتی۔

(۶)۔ بچّوں کی نفسیات کو سمجھنے کی کوشش کرنا ہمارا فرض ہے۔ اور ان کی شخصیت کا احترام لازمی۔ اپنی سچی
محبت اور خدمت سے ہم ایک بچّہ کی نشو و نما میں جو امداد کرتے ہیں وہ سخت گیری اور طعن و تشنیع سے نہیں کر سکتے۔ ہمیں
اپنے غصّے کو قابو میں رکھنا چاہیئے۔ اپنی غلطیوں کا ذمّہ دار معصوم بچّوں کو ٹھہرا کر اُن پر غصّہ اتارنے کا کوئی حق نہیں ہونا چاہیئے

(۷)۔ ایک مثال ہے کہ "بچّہ ماں کے پیٹ سے سیکھا سکھایا پیدا نہیں ہوتا" ہر بچّہ کو سکھایا جاتا ہے۔ انسان
بچّہ، اپنا نیک و بد اور نفع و نقصان کچھ نہیں جانتا۔ اس کو ہر قدم پر رہنمائی کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور ظاہر ہے کہ اس کے
سب سے پہلے رہبر خود اس کے ماں باپ ہوتے ہیں۔ اور پھر درجہ بدرجہ دیگر اہلِ خانہ۔ نانا۔ نانی۔ دادا، دادی۔ بہن بھائی
وغیرہم۔ لہٰذا یہ بھی غلط ہے کہ بچّہ کو یونہی چھوڑ دیا جائے۔ نیک و بد کا فرق نہ بتایا جائے۔ بُرائی سے نہ روکا جائے۔ او

اپنے دل کو غلط تسلیاں دے لی جائیں کہ "کیا ہے، بچّہ ہے، جوان ہوگا اور عقل آئے گی تو خود ہی ٹھیک ہو جائے گا۔" یہ طریقہ بھی درست نہیں۔ یاد رکھیئے کہ عادت پختہ ہونے کے بعد مشکل سے ہی بدلتی ہے۔ جس بچّہ کو بچپن سے ہی جھوٹ بولنے، دھوکا دینے، چوری کرنے اور غیبت وغیرہ کی عادات پڑجائیں۔ وہ کبھی مخلص اور دیانتدار نہیں بن سکتا ہے۔

(۸)۔ میں اپنے ذاتی تجربات، بچپن کے واقعات اور خاندانی ماحول واثرات کی بنار پر جو نتیجہ اخذ کر سکی ہوں وہ یہ ہے کہ بچّوں کی تربیت، ماں اور باپ دونوں کا مشترکہ فریضہ ہے۔ لیکن ماں کا زیادہ۔ تقسیم کار کی بنار پر گھر سے باہر کی ذمّہ داریوں اور معاشی ضروریات کی فراہمی کا بار مَرد کے کاندھوں پر زیادہ ہے۔ عورت گھریلو معاملات کی مالکہ اور ذمّہ دار ہے، اس لئے بچّوں کی تربیت کا اصل بار اور اُن کے مناسب آرام وآسائش اور تعلیم وتربیت ہر بات کی ذمّہ داریاں ماں پر ہوتی ہیں۔ باپ کا جا و بیجا دخل' انتظام کو درہم برہم کر دیتا ہے۔ اُسے صرف ایک مخلص مشیر کا فرض ادا کرنا چاہیئے۔ ابتدائی تعلیم وتربیت پُوری طرح ماں کے ذمّہ ہو۔ البتہ لڑکوں کے لئے بلوغ کے وقت باپ کی رائے اور مشورہ کو زیادہ اہمیّت ہو، اور اس وقت ماں صرف ایک مخلص مشیر ہو۔

(۹)۔ ہر بچّے کو گھر میں اس کا جائز مقام حاصل ہونا چاہیئے۔ بڑے اور چھوٹے کا لحاظ قائم رکھتے ہوئے۔ ایک دوسرے پر کوئی فوقیت نہیں۔ ہر بچّہ، اپنی جگہ پر واجب التکریم ہے۔ کسی ایک کو دوسرے سے زیادہ رعایت نہ دی جائے۔ کھانے پینے اور لباس ودیگر ضروریاتِ زندگی کے لئے کسی کو دوسرے پر ترجیح نہ ہو۔ ہر ایک کی غلطی کا بار اُسی پر ہو۔ ایک کی غلطی کی سزا دوسرے کو نہ دی جائے۔ نہ یہ ہو کہ ایک کو تو اُسی غلطی پر سزا دی جائے اور دوسرے کو کچھ نہ کہا جائے۔

(۱۰)۔ بچّے کو غلطی سے آگاہ کرنا لازمی ہے اور نیک راہ بتانا بھی ضروری۔ لیکن اس احتیاط کے ساتھ کہ اس کی عزّتِ نفس کو دھکّا نہ لگے۔ نرمی، محبّت اور رواداری یہ وصف اپنی حَد کے اندر توازن قائم رکھّے ہوئے ہوں۔ غلطیوں کو بھی محبّت کی نگاہ سے دیکھا جائے، اور نرمی سے غلطی کے نتائج سے آگاہ کر کے آئندہ کے لئے احتیاط کا سبق دیا جائے۔ اگر اثر نہ ہو تو گھبرا کر غصّے ہونا بیکار ہے۔ اور لعن وطعن اُس سے بھی زیادہ مُضر۔

بچّہ والدین کے سامنے کچھ کہہ نہیں سکتا۔ لیکن صرف ایک عمر تک۔ اور پھر نفسیاتی طَور پر یہ ہوتا ہے کہ اگر اس کی شخصیت کا احترام نہ کیا جائے اور اُسے سچّی محبّت اور رہنمائی گھر سے نہ ملے، تو وہ غیر شعوری طَور پر ماں باپ یا دیگر اہلِ خانہ سے متنفّر اور دور ہوتا چلا جاتا ہے۔ حتّٰی کہ وہ مقام آجاتا ہے جہاں اُسے کسی کی پرواہ نہیں رہتی، بلکہ وہ والدین کو دُکھ پہنچا کر خوش ہوتا ہے۔

بار بار اور مختلف طریقوں سے صحیح بات کو دُہراتے رہنے سے، اور پسندیدہ اخلاق وبلند اقدارِ زندگی کی مثالوں سے بچّے پر خوشگوار اثرات پڑتے ہیں۔ اگر شروع ہی سے بچّے کے دل میں ماں کی محبّت واحترام قائم ہو جائے تو وہ از خود بہت سی غلطیوں سے محفوظ رہتا ہے۔

(۱۱)۔ ہر بچّے کی طبیعت جدا ہوتی ہے، کوئی اپنی غلطی جلد تسلیم کر لیتا ہے اور اُس پر پشیمان ہوتا ہے، کوئی اپنی غلطی تسلیم نہیں کرتا اور اپنے نظریہ کو ہر حال میں درست سمجھتا ہے۔ وہ صحیح مشورہ کو بھی اپنے پر زیادتی خیال کرتا ہے۔ یہاں بھی صبر و ضبط سے کام لینا چاہیئے اور بچّہ کو موقعہ دینا چاہیئے کہ وہ از خود غور کرے۔ اور اپنی غلطی کو سوچ سمجھ کر تسلیم کرے اور پھر آپ کی طرف رجوع ہو۔ زبردستی معافی منگوانا بالکل بیکار ہوتا ہے۔

(۱۲)۔ بچّوں کے آپس کے جھگڑے نوّے فیصدی از خود حل ہو جاتے ہیں۔ اُن میں بے جا دخل دینا، آپس میں زیادہ فساد کا باعث بنتا ہے۔ دور اندیشی یہی ہے کہ اپنے کھیل کود کے فیصلے اُن کو خود کرنے دیئے جائیں۔ اگر وہ از خود رجوع کریں تو معاملہ، دونوں فریق سے صبر و ضبط کے ساتھ سُن کر، فیصلہ عدل کے ساتھ کیا جائے۔ جس کی زیادتی ہو، اُس کو نرمی اور محبّت سے سمجھانا چاہیئے۔ اگر زیادتی کرنے والا اپنی زیادتی پر قائم رہے تو پھر دُوسروں کو یہ تاکید کرنی چاہیئے کہ وہ اس کے ساتھ تعاون نہ کریں۔ کچھ عرصہ کے لیئے کھیل و تفریح میں اُسے شریک نہ کریں، اور اُسے اتنا وقت مل جائے کہ وہ اپنے لیئے خود سوچے اور اپنی زیادتی کو محسوس کر کے خود دستِ محبّت بڑھائے۔ ایسی صُلح ہمیشہ پائیدار ہوتی ہے۔

(۱۳)۔ بچّوں میں خود اعتمادی۔ قوتِ فیصلہ اور ذمّہ داریوں کا احساس پیدا کرنا اور انہیں بیدار رکھنا۔ ان کی شخصیت کی نشو و نما کے لیئے لازمی ہے۔ روزمرّہ کی چھوٹی چھوٹی باتوں میں اپنا فیصلہ منوانا اُن کی شخصیت کو اُبھرنے اور سنورنے نہیں دیگا۔ مثال کے طور پر کھلنے پینے کے معاملہ میں بہت زیادہ اِصرار یا لباس کی وضع قطع اور رنگ کے معاملہ میں اپنی پسند اور فیصلہ زبردستی اُن پر عائد کرنا اُن کی قوتِ فیصلہ کو کمزور کرنا ہے۔ مناسب غذا اور سادہ لباس کی طرف رہنمائی بہتر ہے۔ اپنے حالات کے مطابق بعض امور میں خاندانی روایات کی پابندی غیروں کی نقالی سے بہتر ہے۔ "کوّا چلا ہنس کی چال، اپنی بھی بھُول گیا"۔

(۱۴)۔ بچّوں کے سامنے اپنی مثال ہر وقت دینا کہ ہم ایسے تھے اور ایسا کرتے تھے، کوئی قابلِ تعریف بات نہیں۔ ہم کیا ہیں، بچّوں کو یہی نظر آسکتا ہے۔ اس لئے پہلے اپنے کردار میں پاکیزگی اور بلندی پیدا کرنی لازمی ہے۔ ہر وہ خوبی جو ہم اپنے بچّے میں دیکھنا چاہتے ہیں پہلے ہم میں نمایاں ہونی چاہیئے۔ اگر ہم اپنے غصّہ کو ضبط نہیں کر سکتے۔ اگر ہم غلطیوں سے درگذر نہیں کر سکتے۔ اگر ہم غلط بیانیاں کرتے ہیں۔ دوسروں پر اعتراضات اور طعن و تشنیع ہمارا شیوہ ہے تو ہماری گود میں پلے ہوئے بچّے کس طرح اعلیٰ اخلاق اور پاکیزہ کردار کے مالک بن سکتے ہیں؟ محبت و صداقت، خدمت و محنت، ضبط و تحمّل، صبر و استقلال، شجاعت اور سخاوت کا جو سبق، ہم اُن کو گود میں دیں گے، وہ کبھی رائگاں نہیں جا سکتا۔ محبّت اور خدمت صرف ماں باپ اور بھائی بہنوں کی نہیں، بلکہ پُوری انسانیت کی۔ درجہ بدرجہ، جوں جوں عقل و فکر کی سطح بلند ہوتی جائے" یہ ذہن نشین کراتے رہنا چاہیئے کہ ہر فردِ انسانی دوسرے افراد کی محنت اور محبّت کا مرہونِ منّت ہے۔ اور اپنے اپنے مقام پر، ہر ایک کو دوسرے کی خدمت اور آرام کے لیئے اپنا حصّہ پُورا پُورا ادا کرنا چاہیئے۔

(۱۵)۔ بیٹا اور بیٹی، دونوں نعمتِ خداوندی ہیں۔ دونوں کے حقوق برابر ہیں۔ اس لئے تربیت کے معاملہ میں بھی دونوں کو یکساں طور پر سمجھنا چاہیئے۔ لڑکوں کو ہر معاملہ میں رعایت دینا اور لڑکیوں پر سخت پابندی رکھنا حق و عدل کے منافی ہے، اور بعض اوقات اسکے

نتائج دونوں کے حق میں مُضر ثابت ہوتے ہیں۔

لڑکوں کو باہر کے کام سے دلچسپی زیادہ ہوتی ہے، اس لئے عمر کے مطابق، روزمرّہ کے کاموں میں اُن سے مدد لینا، ایک طرف اُن میں خود اعتمادی پیدا کرتا ہے، کام کا طریقہ سکھاتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ ایک دوسرے کی خدمت، مدد اور ہمدردی کا جذبہ پیدا کرتا ہے۔

لڑکیوں کو گھر کے اندر کام کاج میں ضرور دلچسپی دلانا چاہیئے۔ عورت کا اوّلیں مقام بہرصُورت گھر ہی ہے۔ یہ قانونِ قدرت ہے، اس کے خلاف جنگ کرنا، نادانی ہے۔ تعلیم انتہائی ضروری ہے۔ دونوں کے لئے۔ لیکن لڑکیوں کے لئے تعلیم کے علاوہ، امورِ خانہ داری میں مہارت بھی لازمی ہے۔ جس طرح لڑکے باہر کے کاموں سے خوش ہوتے ہیں، اور اُس سے اُن میں خود اعتمادی و خدمت کا جذبہ پیدا ہوتا ہے، اسی طرح لڑکیاں بھی گھر کے کام کاج سے سلیقہ، صفائی اور کفایت شعاری سیکھتی ہیں، اور اپنی آئندہ ذمّہ داریوں کا احساس اُن میں پیدا ہوتا ہے۔

لڑکوں کی تفریحات میں قدرے آزادی بھی ضروری ہے، لیکن عمر کے لحاظ سے۔ وہ ہر وقت گھر میں ہی کھیل کر خوش نہیں رہ سکتے۔ اگر گھر اتنا بڑا ہو کہ ان کے کھیل کے لئے موزوں مقام مخصوص ہو سکے تو اس حالت میں انہیں اپنے ساتھیوں کو گھر پر بلانے کی اجازت ہونی چاہیئے، اور ساتھ ہی غُل اور شور کے لئے بھی تیار رہنا چاہیئے۔ یہ نہیں کہ اُن کو باہر کھیل کے لئے بھی نہ جانے دیا جائے اور شور و غُل پر غصّے ہو کر ڈانٹا جائے۔ بچّے اپنے ساتھیوں کے سامنے اسے اپنی ذلّت سمجھتے ہیں۔ اُن کی عزّتِ نفس کو دھکّا لگتا ہے، اور اس کا اثر والدین کے خلاف ان کے جذبات میں اُبھرتا ہے۔

لڑکیوں کے لئے بھی تفریح اور ورزش وغیرہ اسی قدر ضروری ہے۔ لیکن تفریح کا انتظام اگر گھر پر ہی ہو سکے تو بہتر ہے۔ ناسمجھ لڑکیوں کو تنہا کلبوں اور پارکوں میں کھیل کود کیلئے بھیج دینا ان کی آئندہ زندگی کے لئے نقصان دہ ہے۔ اور یہی وہ مقام ہے جہاں لڑکے اور لڑکی کی تربیت میں کچھ فرق کرنا لازمی ہے۔

حفاظتِ عفت و عصمت مستقل قدر ہے، اور دونوں کے لئے یکساں طور پر لازمی۔ لیکن بدقسمتی سے ہمارے معاشرہ نے دونوں کے لئے مختلف پیمانے بنا رکھے ہیں۔ اس لئے جب تک ہم اپنے معاشرہ کو نہ بدلیں اور صحیح اقدار کو نہ قائم کریں۔ اُس وقت تک یہ ہمارا مقدس فرض ہے کہ جو امانت بیٹی کی صورت میں ہمیں سونپی گئی ہے اُس کی حفاظت میں کسی ادنیٰ سی غلطی کا ارتکاب بھی نہ ہونے دیں۔ ہمارے موجودہ معاشرہ میں، بدطینت عناصر کی زیادتی ہمارے فرائض کو اور بھی شدید بنا دیتی ہے۔ یہ حفاظتی تدابیر، لڑکیوں کے لئے بیجا سختی نہیں ہے۔ بلکہ عینِ محبّت و رحمت ہے۔ عمر کے ساتھ ساتھ پاکیزہ ماحول میں پرورش پائی ہوئی لڑکیاں اپنی عصمت کی حفاظت خود کرنے کے قابل ہو جاتی ہیں۔ قرآن، عفتِ قلب و نگاہ پر زور دیتا ہے اور یہی خصوصیات حورانِ جنّت کی بتاتا ہے۔ قوم کی تقدیر عورت کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ اس لئے عورت کو پیکرِ عفّت و عصمت ہونا چاہیئے۔ پاکباز اور عقل و فہم کی مالک۔ ہماری بچیوں کو آج کل ذرا سی بھی پابندی ناگوار ہے۔ لیکن اگر شروع ہی سے ان کی تربیت، نظم و

(بقیہ صفحہ ۱۱۱ پر دیکھئے)

میرے تاثرات

محترمہ پروفیسر سعیدہ اختر ۔ لیڈی میکلیگن ٹریننگ کالج ۔ لاہور

پہلے آتی تھی حالِ دل پہ ہنسی　　اب کسی بات پر نہیں آتی
ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی　　کچھ ہماری خبر نہیں آتی

آج سے تین برس بیشتر، ہم اپنے آپ کو سچّا اور پکّا مسلمان سمجھتے تھے۔ اور اب جبکہ اسلام کے مطالعہ اور اس کے سمجھنے کا موقعہ ملا تو کچھ کچھ دین تو سمجھ میں آیا ہے، لیکن خود کو مسلمان سمجھنا دشوار ہو گیا ہے ــــــ اگرچہ ایمان اُس وقت بھی یہی تھا کہ دنیا بھر کے مذاہب میں اسلام کا مقام ارفع و اعلیٰ ہے۔ اور اسلام رہتی دنیا تک کے لئے نوعِ انسانی کی راہبری کا پیغام لیکر آیا ہے۔ لیکن یہ پیغام پوری نوعِ انسانی تک کیوں نہ پہنچا؟ کیسے پہنچے گا؟ کون پہنچائے گا؟ ان سوالات کا جواب، اپنے بس کی بات نہ تھی۔ اسلام اپنی بے پناہ وسعتوں اور بلند ترین اقدارِ حیات کو لئے ہوئے صرف پانچ ارکان میں محدود ہو کر رہ گیا تھا۔ اور ہماری سمجھ کے مطابق مسلمان ہونے کا مقصد یہی تھا کہ ان پانچ ارکان میں سے زیادہ سے زیادہ رکن ادا کر کے زیادہ سے زیادہ مسلمان ہو جائیں اس اعتبار سے اگر ہم اپنے آپ کو پکّا اور سچّا مسلمان سمجھتے تھے تو اس میں کچھ ایسا اپنا قصور بھی نہ تھا۔ کلمہ۔ نماز۔ روزہ۔ زکوٰۃ اور حج۔ اسلام یہی تو تھا ــــــ کلمۂ طیّبہ کا پڑھنا، ایمان لانے کی سب سے پہلی شرط۔ جب کسی کو مسلمان بنایا جاتا ہے تو اسی سے ابتدا کی جاتی ہے۔ اس کے معانی اور عملی پہلو کو سمجھنا تو علیحدہ سی بات ہے، اسے عربی زبان کے صحیح مخرج اور اعراب کے ساتھ ادا ہونا چاہیئے۔ ایرانی بھی شاید اسی طریق پر راتوں رات ایمان لائے تھے کہ دلوں پر مجوسیت کا قبضہ برقرار رہا۔ ہم راتوں رات ایمان لانے والوں میں سے تو نہ تھے۔ مسلمان گھرانوں ہی میں پیدا ہوئے، مگر ایمان کی پہلی شرط بس اسی انداز میں کلمہ پڑھ لینے کی حد سے تجاوز نہ کر سکی۔ ورنہ اگر کلمۂ طیّبہ ہی کو سمجھ کر اُسے اپنی زندگی میں شریک کر لیا ہوتا تو ایک عظیم انقلاب گِرد و پیش میں آجاتا، اور یہ بے تحاشا شرک۔ بے شمار بدعتیں، اگر چاہتیں بھی تو مسلمانوں کی عملی زندگی میں داخل ہونے کا کوئی راستہ ڈھونڈ نہ پاتیں ــــــ ہم اس کلمہ کو دن میں کئی بار استعمال کرتے ہیں۔ خود بھی پڑھتے ہیں اور بچوں کو سکھلاتے ہیں۔ لیکن جب کسی بچّے کے پیٹ میں درد اُٹھتا ہے۔ آنکھ، ناک، کان، دانت میں کہیں تکلیف ہوتی ہے تو بغیر مولوی صاحب کے دَم کئے جا ہی نہیں سکتی۔ اور باری کا بخار تو، جب تک صبح سویرے ٹونے ٹوٹکے نہ کئے جائیں ممکن ہی نہیں کہ اُتر جائے۔ سُوکھے کی بیماری ہو تو کسی کا سایہ ہوتا ہے۔ دوا دارو کا تو کوئی کام ہی نہیں۔ نہ ہی "بیچارے اللہ میاں" کہیں بیچ میں آتے ہیں۔ زندگی کا کوئی مسئلہ ہو، کوئی دقّت ہو اُسے دُور کرنے والے پیر جی ہیں یا کسی تکیہ پر بیٹھے ہوئے سادھو فقیر۔ جو کرامات ان کے پاس ہیں، وہ بھلا اللہ میاں کے دیئے

ہوئے علم سے ایجاد کردہ ادویات میں کہاں ہوسکتی ہیں۔ ہاں اگر بچہ مرگیا تو پھر سارا الزام اللہ میاں کے سر ـــــ خدا کی مرضی یہی تھی، کیا کیا جائے ـــــ ذہنی، جذباتی، خیالی اعتبار سے، ان جادو ٹونوں۔ تعویذ گنڈوں، جن اور پری کے سایہ میں الجھی ہوئی عورتوں سے ذرا پوچھ کر دیکھئے۔ "دلہن! تم مسلمان ہو کیا۔؟" بڑی ہی زوردار "ہاں" سُنیئے گا، اور ساتھ ہی وہ سُنا دے گی لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ ـــــ اللہ اکبر، کلمۂ طیبہ پڑھنے والوں کے اعمال و افکار، اس کلمہ کی رُوح سے کس قدر دُور ہیں۔؟

ہم بھی تین برس پیشتر کلمہ اسی انداز میں پڑھتے تھے۔ اگرچہ اتنی بدعتیں اس کے ساتھ شریک نہیں کی تھیں۔ تاہم جب کبھی زندگی کا کوئی اہم مسئلہ تفکّر و تردُّد لئے ہوئے سامنے آتا، تو گولڑہ شریف والے پیر صاحب کو خط ضرور لکھ دیتے تھے کہ آپ کی دعا و برکت کے بغیر یہ گُتھّی سلجھے گی نہیں۔

دوسرا رکن اسلام کا ہم نے سیکھا تھا، نماز ـــــ وقت پر باقاعدگی سے پُوری رکعتیں ادا کرتے ہوئے، طمانیتِ قلب کے ساتھ اللہ کے حضور میں جھکنا۔ اور واقعی جب انسان خضوع و خشوع کے ساتھ جھکتا ہے تو اس سے بڑا ہی سکون ملتا ہے اور جب اس کی عادت ہو جاتی ہے تو پھر ایک وقت نماز کا اگر یونہی گزر جائے تو یوں لگتا ہے جیسے کوئی چیز کھو سی گئی ہے۔ یہی کیفیت اپنی بھی تھی۔ نماز پڑھ لینے سے بڑی ہی مسرّت اور اطمینانِ قلب نصیب ہوتا تھا۔ لیکن آج نماز پڑھنے کے بعد وہ دلی خوشی اور اطمینان نہیں ملتا جو تین برس پیشتر ملتا تھا۔ دل اس سے آگے، کسی اور فکر، تمنّا اور تجسُّس میں رہتا ہے۔ وہ اطمینان درحقیقت ہمارا اپنا پیدا کردہ تھا۔ اب اس اطمینان کی فکر اور تمنّا رہتی ہے جسے نماز پیدا کرتی ہے۔

آگے بڑھیئے تو اگلا رکن ہے روزہ۔ مجھے اپنے معاشرہ میں یہ بات بڑی عجیب معلوم ہوتی ہے کہ ہمارے ہاں ایک خاص طبقہ ایسا ہے جو روزے کو نماز پر ترجیح دیتا ہے۔ خصوصاً جہلا کا وہ طبقہ جس کا ذکر میں نے کلمۂ طیّبہ کے تذکرے میں بھی کیا ہے۔ اِن مسلمان گھرانوں میں میں نے دیکھا کہ سات سال کا بچّہ بھی روزہ رکھتا ہے لیکن نماز سارے گھر میں کوئی نہیں پڑھتا۔ بس روزے رکھتے اور افطار کرتے چلے جاتے ہیں ـــــ بلکہ عید کا دن گزار لینے کے بعد پھر روزے رکھنے شروع کر دیتے ہیں ـــــ یہ راز میری سمجھ میں آج تک نہیں آیا کہ یہ لوگ، جو روزے رکھتے ہیں اور نماز نہیں پڑھتے۔ روزہ اُن کی ذہنی سطح پر اتنا اجاگر کیوں ہے۔؟ شاید پرویز صاحب اس پر کچھ روشنی ڈال سکیں ـــــ بہرحال اپنی استعدادِ جسمانی کے مطابق، ہم بھی یہ رکن ادا کرتے رہے۔

باقی رہ گئے زکوٰۃ اور حج۔ زکوٰۃ تو گویا اللہ میاں کا قرضہ ہے۔ سال بہ سال حساب کرو اور اللہ کا قرضہ چکا دو۔ پھر اللہ میاں جانیں اور ان کے غریب غربار اور محتاج! ـــــ ہم جو سَو روپے میں سے اڑھائی روپے نکال کر اُسے دیتے ہیں تو اس سے وہ ان سب کا "رازق" بن جاتا ہے۔ جن کا رزق چھین کر ہم کھا جاتے ہیں۔ اور پھر اگر غریب غربا زیادہ ہوتے جاتے ہیں اور ہمارے دیئے ہوئے اڑھائی فی صد سے "اللہ میاں بیچارے" اُن سب کا کھانا پُورا نہیں کر سکتے تو اس میں ہمارا کیا قصور۔؟ ہمیں تو حکم تھا کہ اڑھائی فیصد دیدو۔ وہ ہم نے دیدیا۔ اب ہم تو ہو گئے پکّے مسلمان۔ اور جنّت کے حقدار بھی۔ اس لئے بے فکر ہیں اور مطمئن۔

غرض یہی کچھ کرتے رہے اور بہ زعمِ خویش خود کو مسلمان سمجھا کئے ـــــ میں یہ تو نہیں کہہ سکتی کہ ہم اب اس سے کچھ زیادہ کرنے لگے ہیں۔ تاہم خدا کو الزام دینے والی بات ذہن سے نکل گئی ہے۔ اور یہ مسئلہ کچھ کچھ سمجھ میں آنے لگا ہے کہ اللہ کے رازق ہوتے ہوئے بھی سینکڑوں اور ہزاروں انسانوں کو پیٹ بھر کر روٹی کیوں نہیں ملتی۔؟

لیجئے باقی رہ گیا حج، اس کے لئے صاحبِ استعداد ہونا ضروری ہے۔ گویا حج کو فرض قرار دے کر اسلام نے اس کی بھی ترغیب دی کہ پیسے جمع کرو تاکہ حج کا فریضہ ادا کر سکو۔ اور کہنے والوں نے یہ بھی کہہ دیا کہ حج کر لو تو زندگی بھر کے سارے گناہ دھل جاتے ہیں۔ گویا سارے گناہ اُن کے جسم پر جمے ہوئے تھے۔ آبِ زمزم سے نہالئے تو ساری گندگی اُتر گئی۔ گناہ کئے جاؤ۔ اللہ رحیم و غفار ہے۔ اور مرنے سے پہلے جب قوائے ذہنی و جسمانی متزلزل ہوئے جا رہے ہوں، جلدی سے جاؤ اور حج کر لو۔ جنت کا پاسپورٹ مل گیا۔ رسول کی شفاعت ہاتھ آگئی۔ اب جنت کی طرف بڑھنے سے کون روک سکتا ہے۔؟ جس بکرے کی قربانی حج کے موقع پر دی تھی، وہ بھی تو شفاعت کرے گا۔ پُلِ صراط پر سے بچا کر لے جائے گا۔ ایک بندہ، اور اُسے اتنے بچانے والے۔ دوزخ کی آگ کو تو خود ہی شرمندہ ہو کر گُل ہو جانا چاہیئے۔

ہم جب اپنی تعلیم مکمّل کرنے کے بعد برسرِ روزگار ہوئے اور اپنے پاس کچھ پیسے بھی جمع ہو گئے کہ تو حسنِ اتفاق کہیئے کہ اپنے کچھ خیر خواہ حج کے لئے جا رہے تھے۔ ہم بھی تیار ہو گئے۔ کچھ اور خیر خواہ ایسے بھی تھے جنھوں نے روکا کہ ابھی سے حج کے لئے کیوں جاتی ہو۔ لیکن اپنے سر پر تو یہ دُھن سوار تھی کہ اسلام کے سارے رکن ادا کر کے دیکھو تو سہی کہ شخصیت میں کتنی وسعتیں پیدا ہوتی ہیں۔ چنانچہ ہم نے یہ رکن بھی ادا کر دیا ـــــ اور اب کونسی کسر باقی رہ گئی تھی کہ ہم خود کو پکّا مسلمان نہ سمجھتے۔

لیکن ـــــ حج سے واپسی پر بجائے اس کے کہ دل مسرّت و خوشی سے جھُوم جھُوم جاتا اور اپنی شخصیّت میں واقعی کسی وسعت کا احساس پیدا ہوتا۔ کسی بہت ہی بڑی کمزوری، بہت بڑی خامی کا احساس بیدار ہونے لگا۔ حج پر ادا ہونے والی رسُومات نے طرح طرح کے وسوسے اور شبہات دل میں پیدا کر دیئے ـــــ کیا اسلام صرف یہی ہے؟ لیکن وہ پیغام کہاں ہے جو رہتی دنیا تک کے لئے ہے، جو پُوری انسانیت کے لئے ہے؟ یہ خیالات اُبھرے اور دل ڈانواں ڈول ہو کر نئے سرے سے پھر اسی فکر میں ڈوب سا گیا ـــــ اسلام کے پورے رُکن ادا کر کے بھی ہم وہیں کے وہیں تھے ـــــ آخر اسلام کیا ہے؟ وہ پیغامِ ابدی کہاں ہے۔ جس میں پوری نوعِ انسانی کی نجات ہے؟ اسلام نہ مسلمانوں کی انفرادیت میں مِلا، نہ اجتماعیت میں۔ نہ کسی کتاب میں۔

قرآن کی تلاوت تیز گام گاڑی کی طرح کرتے چلے آئے تھے۔ بیسیوں مرتبہ پڑھا ہوگا۔ کہیں کہیں اور کبھی کبھی رُک کر ترجمے کی جستجو بھی کی تھی۔ لیکن لگتا یہی تھا کہ سوا چند باتوں کے کہ اللہ میاں نے بار بار یا تو دوزخ سے ڈرایا ہے، یا پھر یہ کہا ہے کہ میری عبادت کرو، آخر اللہ میاں کو اس کی کیا ضرورت تھی کہ ہم اس کے نام کی تسبیح کرتے چلے جائیں۔؟ لیکن یہ بات کسی سے کہنے کی جرأت کہاں تھی۔

ایک مرتبہ رمضان کے مہینہ میں، یہ فیصلہ کیا کہ اس ماہِ مقدس میں اسلامی کتب کا مطالعہ کیا جائے گا۔ چنانچہ سب سے پہلی کتاب جو ذہن میں آئی وہ تھی بخاری شریف ـــــ اس کی جلدیں لائبریری سے لے کر سامنے میز پر رکھ لیں کہ دن بھر میں کام کے دوران میں جب کبھی بھی فرصت کا وقت ملیگا حدیث کا مطالعہ کیا جائے گا۔ ایک حصّہ جوں توں ختم کیا۔ دوسرا با دلِ نخواستہ اٹھایا کہ شاید اس میں کچھ باتیں کام کی ہوں۔ مگر چند ہی صفحے پڑھنے کے بعد، اس خیال سے کہ کہیں حدیث پڑھتے پڑھتے اسلام ہی سے منحرف نہ ہو جاؤں، کتابیں لائبریری میں واپس بھیج دیں۔ دین کی سچّائیوں اور گہرائیوں کی جستجو میں اسلام کی جو ارفع و اعلیٰ عمارت تخیّل میں بنا رکھی تھی مسمار ہوتی ہوئی دکھائی دی۔ خدا کے آخری رسولؐ کی شخصیت ذہن میں گم سُم سی ہونے لگی۔ خاکم بدہن۔ کیا محمدؐ عربی، زندگی کے اِنہی مسائل پر انسانوں سے گفتگو کیا کرتے تھے؟ دل و دماغ، پراگندہ سے ہونے لگے۔ غرض عجیب ذہنی الجھن اور کشمکش تھی کہ اِنہی دنوں ایک روز دورانِ گفتگو میں اپنی ایک دوست سے اس کا ذکر آیا تو کہنے لگیں۔ "پرویز صاحب لاہور آرہے ہیں، شاید وہ اِن مسائل کو حل کرنے میں مدد دیں۔" پوچھا "یہ پرویز صاحب کون ہیں۔؟" جواب ملا "بہت بڑے عالم ہیں، بہت سی کتابیں لکھی ہیں"۔

آج مجھے تعجّب ہوتا ہے کہ اس سے پیشتر ہم نے نہ پرویز صاحب کا نام سُنا تھا نہ ان کی کوئی تصنیف نظر سے گزری تھی۔ معلوم کیوں؟ شاید اپنی ہی کوتاہیٔ نظر اس کا بہانہ ہو۔ بہر حال، اسی دوست کی معرفت ایک کتاب پڑھنے کو ملی۔ نام تھا "اسبابِ زوالِ اُمّت"۔ کتاب مختصر سی تھی، ایک ہی نشست میں ختم کر ڈالی۔ اور پھر کتنی ہی دیر تک میں اور مس حمید خواجہ، پرویز صاحب کے تفکّر کی گہرائی، اندازِ بیان کی دلکشی اور اس کے تاثرات پر گفتگو کرتی رہیں۔

تھوڑے ہی دنوں بعد پرویز صاحب لاہور تشریف لے آئے، اور سب سے پہلا خطبہ جو کانوں نے سُنا وہ تھا "قانونِ مکافاتِ عمل"۔ پرویز صاحب کی زبانی انسانوں کے عمل پر، اللہ کے قانون کی حکمرانی بڑی ہی جاندار معلوم ہوئی۔ اور پھر جیسے جیسے خطبات کا سلسلہ آگے بڑھتا گیا، ذہن کے بند دریچے آہستہ آہستہ کھُلنے لگے۔ اور اسلام اپنی ذات سے ہٹ کر، قوم و ملک کی حدوں کو پار کرتا اور فضائے بسیط پر چھایا ہوا محسُوس ہونے لگا۔ پرویز صاحب نے ہمیں قرآن اور اسلام سے پیار کرنا سکھایا۔ اس کتابِ مقدس کو نئے انداز میں پڑھنا اور سمجھنا سکھایا۔ جھُوم جھُوم کر، رقّت انگیزیوں کے ساتھ، تیز گام جیسی رفتار سے پڑھنے کی بجائے، اس کی ایک ایک آیت پر رُکنے اور غور کرنے کی ترغیب دی ـــ مگر ـــ یہ ترغیب دل کا رہا سہا سکون لٹا سا گئی ہے۔ یہ سوچ کر بڑی ہی اضطرابی کیفیت پیدا ہوتی ہے کہ اسلام اپنی اصلی اور پائدار شکل میں صرف اسی کتابِ مقدس میں باقی رہ گیا ہے۔ نہ مسلمانوں کے نام کے ساتھ چسپاں ہے۔ نہ ان کے اعمال و معاشرت سے وابستہ۔ نہ دنیا کی کسی سیاست میں اس کا رنگ جھلکتا ہے۔ اسلام نے فرد و معاشرے کو ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم قرار دیا۔ آج ہمارے پاس نہ ایسا معاشرہ ہے جو مؤمن پیدا کرے اور نہ ایسے افراد ہیں جو اِسلامی معاشرہ کو متشکّل کر کے دکھائیں۔ اور وہ چار دل جو اس تمنّا میں تڑپتے ہیں، ایسی قوتیں کہاں سے لائیں کہ ہم اپنی زندگی میں نظامِ خداوندی کو محسوس شکل میں دیکھ سکیں ـــ

ہمارا اپنا مقام کہاں ہے۔؟ کچھ سُجھائی نہیں دیتا ـــــ ہم نے پرویز صاحب کے خطبات سُنے ہیں۔ اُن کی تصانیف کا مطالعہ کیا ہے۔ دل میں کُشادگی، نظر میں وسعت، خیال میں گہرائی۔ تخیل میں بلندی، تصورات میں نیا رنگ آیا ہے۔ مگر عملی اعتبار سے ہم لوگ اتنے ناکارۂ محض ہو چکے ہیں کہ زندگی میں کوئی حرکت دکھائی نہیں دیتی ـــــ لیکن اصل یہ ہے کہ باہر کی دنیا میں انقلاب لانے سے بیشتر دلوں کے اندر تبدیلی پیدا ہونا ضروری ہوتا ہے۔ پرویز صاحب نے اِس اندرونی تغیر کی طرح ڈالی ہے، اور ہمارے کندھوں پر یہ بوجھ رکھ دیا ہے کہ ہم باہر کی دنیا میں انقلابِ عظیم پیدا کریں، ورنہ اگر ان تأثرات کو لئے ہوئے ہم زمین میں دفن ہو گئے تو نہ پرویز صاحب کے درس دینے کا کوئی نتیجہ برآمد ہوگا نہ ہمارے درس لینے کا ـــــ اور آنے والی نسلیں ہمیں اس کے لئے کبھی معاف نہ کر سکیں گی۔

ہمیں اپنا مقام خود متعیّن کرنا ہے کہ جس منزل کی جھلک دکھائی گئی ہے، اُس تک پہنچنے کے لئے ہمیں کس مقام اور کس رُخ سے قدم اُٹھانا ہوگا۔ تا آنکہ ہمارا ہر قدم ہمیں اُس منزل کے قریب تر لے جائے۔

ہم ہر سال کنونشن کے لئے جمع ہوتے ہیں، کتنا اچھّا ہو، اگر ہم میں سے ہر شخص اس موقعہ پر اپنے کردار کا جائزہ لے اور دیکھے کہ اُس نے خود اپنے آپ کو کتنا مسلمان بنایا ہے۔ اور اگر ہم سب، جو اس وقت اس پنڈال میں جمع ہیں سچ مچ مسلمان ہو جائیں تو یہ ایک عظیم کارنامہ ہوگا۔ والسّلام

بقیہ "عورت کی مظلومی کے اسباب" صفحہ ۸ سے آگے

سطح پر پہنچ کر ہر جماعتی تفریق حرفِ غلط کی طرح مِٹ جاتی ہے۔ مرد و عورت میں بھی فقط ان کی حیاتیاتی ساخت اور اُن کے فرائض کی تمیز باقی رہتی ہے اور بس ـــــ اس تفریق کی بنا پر انہیں مختلف عادات و خصوصیات کا حامل قرار دینا مضحکہ خیز ہے۔

جہاں تک جنسی میلانات کا تعلّق ہے، قرآن اِنہیں شرمناک قرار دیکر انسان کو نفسیاتی الجھنوں میں مبتلا نہیں کرتا۔ بلکہ مستقل اقدار سے ان کی رہبری کرتا ہے اور انھیں ان کا جائز مقام دیتا ہے۔ ایسا معاشرہ جس کی تشکیل قرآن کے کھینچے ہوئے خطوط کے مطابق کی گئی ہو، عورت کو فتنہ نہیں قرار دیتا۔ اور نہ ہی اُسے مرد کی حیوانی خواہشات کی تسکین کا ایک ذریعہ سمجھتا ہے۔ وہ فطرت کے نقشے کے مطابق دونوں کو مختلف فرائض سونپتا ہے، اور اس طرح انہیں ایک دوسرے کی اعانت اور تکمیلِ ذات کے لئے لازم و ملزوم بنا دیتا ہے۔

اس معاشرے کو قائم کرنے کے لئے عورتوں کی جانب سے خاص طور پر ہر ممکن تعاون کی ضرورت ہے، کیونکہ اسی میں ان کی تمام مشکلات کا حل اور ان کی انسانیت اور شخصیت کے تحفّظ کا راز پوشیدہ ہے۔

(ترجمہ پروفیسر ناہدہ منظور) والسّلام

عائلی قوانین

محترمہ حمیدہ جہاں خواجہ۔ وائس پرنسپل لیڈی میکلیگن کالج - لاہور

ہر شخص، خواہ غریب ہو یا امیر، اعلیٰ شخصیت کا مالک ہو یا مجرم، کسی نہ کسی گھر یا خاندان سے تعلق رکھتا ہے۔ یہ آج کا شخص، اِس وقت کی پیداوار نہیں، بلکہ اتنے ہی سال پُرانی بات ہے جتنی اس کی عمر۔ ہم جب کسی مجرم یا غیر متوازن شخصیت کو دیکھتے ہیں تو کُلّیتہً ذمہ داری اس پر رکھ دیتے ہیں اور جس گھر میں وہ پیدا ہوا تھا اور جن ہاتھوں سے اس کی پرورش ہوئی تھی نگاہیں وہاں تک نہیں پہنچتیں۔ اگر ہم پچھلی کڑیوں کا سُراغ لگائیں تو افراد کی کمزوری اور معاشرہ کی خرابیاں گھروں اور خاندانوں میں پلتی ہوئی دکھائی دیں گی۔ اس لئے ایک گھر اور خاندان کی زندگی، اس کا ماحول اور اس کا استحکام نہایت ضروری ہے۔

وہ گھر جہاں انسان پیدا ہوتا ہے۔ جہاں اُس کی پرورش ہوتی ہے اور تربیت کی عمارت کی بنیاد رکھی جاتی ہے۔ اس کے اصول اور قوانین کی بنیاد، انفرادی خوشی اور پسند، یا "ہزاروں سال سے یونہی کرتے آئے ہیں" کی اساس ہوتی ہے۔ معلوم نہیں کوئی یہ کیوں نہیں سوچتا کہ وہ بزرگ اور وہ حالات بھی تو لاؤ جنھوں نے وہ دستور اُس وقت بنائے تھے۔ اس سوال کے ساتھ سوائے اس جواب کے اور کچھ نہیں ہوتا کہ مذہب بھی تو یہی کہتا ہے۔ اور اس مذہب کی آڑ میں لوگ اپنے فرسودہ دستوروں اور بے جان روایات کو زندہ رکھنے کی کوشش کرتے ہیں اور اسی کو مذہب کہتے ہیں۔ اور پھر اس پر جنت کے حصول کا دعوٰے قائم کرتے ہیں۔

فرد کی پیدائش، پرورش۔ تربیت اور تعلیم کی ضرورت کے تحت خاندانی زندگی کا قیام اور اس میں امن و سلامتی ضروری ہے ان مقاصد کے حصول کے لئے ایسے اصول اور قوانین کی ضرورت پیدا ہوتی ہے جن سے خاندان کے افراد اپنے حقوق کی حفاظت اور فرائض کی ادائیگی سے باخبر ہو سکیں۔ کوئی بھی گھر یا معاشرہ، امن و سلامتی کا گہوارہ نہیں بن سکتا۔ جہاں فرد کو یہ یقین نہ ہو کہ اس کا حق اُسے مل جائے گا، اور وہ محفوظ ہاتھوں میں ہے اور وہ خود دوسرے کی حق تلفی نہیں کرے گا۔ اس وقت تک جو عائلی قوانین رائج ہیں وہ کچھ "اب ہوتا آیا ہے" کی پیداوار ہیں۔ نہ تو کبھی ان کا جائزہ لیا گیا اور نہ ہی یہ معلوم کیا گیا کہ موجودہ دستور اور رواج کے بموجب ہماری گھریلو زندگیاں کیسے ناہموار اور نامناسب نتائج بروئے کار لا رہی ہیں۔ اس قسم کا جائزہ لینے کی جرأت کون کرتا۔ کیونکہ عائلی زندگی اور اس سے متعلقہ قوانین اُس دَور کی حکومت یا نظام کی دلچسپی کا سبب نہ تھے۔ پاکستان کے قیام سے پیشتر حکومت کو ان چیزوں سے دور کا بھی واسطہ نہ تھا۔ چنانچہ جو کچھ ہو رہا تھا وہ شخصی ذمہ داری اور روایات تک محدود تھا۔

قیامِ پاکستان کے بعد، پہلی مرتبہ اس ضرورت کا احساس ہوا کہ ان عائلی قوانین کی طرف توجّہ دی جائے، جو رائج الوقت

تھے اور اُن پر نظر ثانی کی جائے۔ ۱۹۵۵ء میں عائلی کمیشن، زیرِ صدارت خلیفہ شجاع الدّین مرحوم مقرر ہوا تھا۔ اور اس نے اپنی سفارشات ۱۹۵۶ء میں پیش کر دی تھیں۔ لیکن ان پر کوئی توجہ نہیں دی گئی۔ اب موجودہ حکومت کے دیگر تعمیری اقدامات میں سے ایک قدم یہ بھی تھا کہ ۳، مارچ ۱۹۶۱ء کو عائلی قوانین کی سفارشات کو منظور کیا گیا۔ اور یہ اعلان ہوا کہ تین ماہ بعد ان پر عمل درآمد شروع ہو جائے گا۔

ان سفارشات میں ایک عام اور قابلِ قبول چیز یہ ہے کہ ہر شادی رجسٹر میں درج ہوگی اور نکاح پڑھانے والا شخص وہ ہوگا جس کے پاس اس کا لائسنس ہو۔ ان حالات میں جب دوسرا شخص نکاح کا فرض ادا کرے گا تب بھی شادی کا اندراج ضروری ہوگا۔ اس ترمیم پر تو شاید کسی کو اعتراض نہیں ہو سکتا لیکن اس سے یہ فرض ضرور عائد ہوتا ہے کہ ہمارے عوام میں سے ہر ایک کے سامنے ایک معاہدہ کو تحریری شکل دینے کے لئے لکھنے پڑھنے کی اہمیت اُبھر کر سامنے آجاتی ہے۔ خاص طور پر اس معاشرہ میں جہاں خواندگی صرف ۱۵ فیصد ہو۔ اس سے خیال ہوتا ہے کہ ہمارے کچھ ناخواندہ افراد کو اس میں دقت پیش آئے اور اسکو بخوشی و رغبت اختیار کرنے کے بجائے وہ گریز کی راہیں نکالیں۔ بہرحال یہ قانون اپنی اہمیت اور قوت رکھتا ہے۔

دوسری سب سے بڑی ترمیم، جو نہایت توجّہ طلب اور دلچسپ ہے، وہ مسئلۂ تعدّدِ ازدواج ہے۔ اس وقت تک یہ بات عام تھی کہ ایک وقت میں ایک مرد، ایک سے زیادہ بیویاں رکھ سکتا ہے۔ اس نکتۂ نظر کو یوں تقویت دی جاتی تھی کہ مرد طاقتور ہوتا ہے، کماتا ہے، اور قرآن نے اس کو یہ حق دیا ہے۔ بھلا جسمانی طاقت کی بنا پر برتری کا اظہار، اور اسی برتری کو ظاہر کرنے کے لئے ایک سے زائد بیویاں رکھنے کا حق، کن دلائل اور نکات سے ثابت ہوتا ہے۔ آخر اس کی دلیل کیا ہے کہ جو طاقتور ہے وہ برتر ہے یا جو زیادہ زوج رکھ سکتا ہے۔ وہ اعلیٰ اور افضل ہے۔ حیوانی سطح پر یہ باتیں شاید اہم قرار دی جا سکتی ہوں، لیکن انسانی درجہ پر برتری کا معیار یہ نہیں، وہ تو صرف ایک ہی معیار ہے، یعنی اعلیٰ کردار یا تقویٰ شعاری۔ بلند کردار شخص وہی ہے جو اپنا حق حاصل کرتا ہے۔ اور دوسرے کے حق کی حفاظت کرتا ہے۔ اور یوں اپنے ہر خیال اور عمل میں انصاف کو قائم رکھتا ہے۔ اِنہی اصولوں کی بنا پر قرآن بھی مَرد کے اوپر اقتصادی ذمہ داری کا بوجھ رکھتا ہے۔ یعنی پرورشِ نسل کی ذمہ داری اور وہ بھی انصاف کے ساتھ۔ سورۂ نساء (آیت ۳) میں جہاں ایک سے زائد ازدواج کا ذکر ہے وہاں اس سے پہلے یتامیٰ کی پرورش اور ان کے مال کی حفاظت کا ذکر ہے۔ اوّل اہمیت یتامیٰ کی پرورش اور ان کی حفاظت کو دی گئی ہے۔ اور اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے یہ حل پیش کیا گیا کہ دو دو اور تین تین بیویاں کر لو۔ لیکن اس کے بعد پھر وہی انصاف کا سوال اہم ہے اور یہ کہہ دیا کہ تم اس حالت میں انصاف نہیں کر سکو گے، اس لئے ایک ہی کی ذمہ داری کو اٹھانا بہتر ہے۔ اس سورۃ کی دوسری اور تیسری آیت سے مرد کی خاندانی زندگی میں جو ذمہ داریاں ہیں انھیں اُبھار کر سامنے لایا گیا ہے۔ اور اسے حاصل کرنے کیلئے چند طریقے پیش کئے گئے ہیں۔ دو یا تین بیویوں کی اجازت، نفسی یا جنسی خواہش کو پورا کرنے کے لئے نہیں دی گئی اور نہ ہی اسکا کوئی ذکر ہے۔ بلکہ جنسی اور نفسیاتی ضرورت کے تحت ایسا کیا جائے تو وہ شخص نفسیاتی طور پر ایک صحت مند کردار کا مالک

نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ وہ ان حالات میں حق وانصاف قائم نہیں رکھ سکتا جن کا وہ نگراں اور سرپرست ہونے کا دعویٰ کرتا ہے۔

موجودہ زمانہ میں جبکہ زندگی کی ضروریات سائنٹفک ایجادات کے سبب پیچیدہ اور وسیع ہوتی جارہی ہیں تو آنے والی نسل کی پرورش۔ تربیت اور تعلیم بھی مشکل تر ہوتی جارہی ہے۔ پیدائش۔ پرورش اور تعلیم کی ذمہ داری والدین پر ہے، اور وہ بغیر تعلیم کے اس ذمہ داری کو پورا نہیں کرسکتے۔ انسانی پرورش کا زمانہ طول طویل ہوتا ہے۔ کیونکہ انسانی بچہ کی پرورش اور تربیت کا زمانہ حیوانی بچہ کی طرح مختصر نہیں ہوتا۔ ابتدائی زمانۂ پیدائش سے چھ سال تک، پھر چھ سے بارہ سال تک، عہدِ طفلی کا زمانہ، پھر بارہ سے سولہ سال تک حصولِ بلوغیت کا زمانہ۔ یہ سب تربیت و تعلیم کا متقاضی ہے۔ اس کے بغیر انسانی بچہ صحیح راہ اختیار نہیں کرسکتا۔ یوں تو تعلیم و تربیت کی ضرورت کبھی ختم نہیں ہوتی بلکہ ساری زندگی جاری رہنی چاہیئے۔ اور اب جبکہ زندگی کے ہر معاملہ میں تیزرفتاری اس قدر آچکی ہے کہ اگر انسان کھڑے ہو کر سستانے کا خیال بھی کرے تو پس ماندگی کے اندھیرے میں جاگرتا ہے۔ آج کا زمانہ تقاضا کرتا ہے کہ ہر فرد کمربستہ کھڑا ہو۔ آنکھیں کھلی ہوں۔ کان مستعد ہوں۔ تمام حواس پورے طور پر تربیت یافتہ ہوں اور دماغ سے تعاون کرتے ہوئے زندگی کو آگے بڑھاتے چلیں۔ بچہ کی پرورش اور تربیت کے لیے ہمیں ایک گھر اور اس میں ہموار اور مستحکم ماحول کی ضرورت ہے۔ جو اسی صورت میں میسر آسکتا ہے جبکہ اس کے قائم کرنے والوں کے حقوق کی حفاظت ہو اور وہ اپنے فرائض سے آگاہ ہوں۔

قابلِ ستائش اور امید افزا بات جو عائلی کمیشن نے پیش کی ہے وہ تعددِ ازدواج کے بارے میں شرائط اور پابندیاں ہیں۔ اور یہ شرائط خاندان کی زندگی کو بہتر، خوشگوار اور مستحکم بنانے کے لیے ہیں۔ عائلی قوانین قرآنی روشنی میں مرتب کرنے کا حکومت کی طرف سے یہ پہلا قدم ہے۔ اور اس کے نافذ ہونے کے بعد جو خوش آئند نتائج نکلیں گے وہ آئندہ سب کے سامنے آئیں گے۔

عائلی قوانین بنانے اور نافذ کرنے کا مقصد عائلی زندگی میں پختگیٔ عمل اور سلامتی پیدا کرنا ہے۔ مردوں کی آزادی یا ان کی حق تلفی نہیں۔ نہ ہی ان کے حقوق کو غصب کرکے عورتوں کے سپرد کرنا، بلکہ مردوں کو ان کی ذمہ داریوں اور فرائض سے آگاہ کرنا اور عورتوں کو ان کے چھنے ہوئے حقوق واپس دینا۔ اور ان کے فرائض سے روشناس کرانا ہے۔ یہ اس راہ کی پہلی داغ بیل ہے معاشرہ میں جسمانی اور دماغی طور پر متوازن شخصیتوں کا ظہور، گھر کے توازن کے استحکام اور سکون پر ہوتا ہے۔ اگر ہمیں اچھے لوگوں کی ضرورت ہے۔ اور ہم ایسا اسلامی معاشرہ قائم کرنا چاہتے ہیں، جس میں ہر شخص کی پوری پوری نشوونما ہو اور کبھی بھی کسی شخص کو یہ اندیشہ نہ ہو کہ اس کی حق تلفی ہورہی ہے۔ جہاں کوئی شخص اپنی ذاتی اغراض اور احساسِ برتری کے لیے دوسروں کی حق تلفی پر مائل نہ ہو سکے۔ تو ہمیں کم سے کم پچاس سال پہلے اپنے گھروں اور خاندانی زندگی کو یوں مرتب کرنا پڑے گا کہ فرد اپنے حق و فرائض سے باخبر ہو، اور اس پر عمل کرتا جائے۔

دو مختلف احوال سے متعلق افراد جب یکجا ہو کر گھر قائم کرتے ہیں تو اس میں ہر قسم کی دقتوں اور مشکلات کا سامنا ہوتا ہے

طبائع کا اختلاف، اقتصادی اختلاف، خیالات ونظریات کا اختلاف۔ یہ سب چیزیں اتنی آسان نہیں کہ ان کو ایکدم اتحاد میں بدل لیا جائے یا نظرانداز کردیا جائے۔ یا ایک کو چھوڑ کر دوسرے کو اختیار کرلیا جائے کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ نظریات کے اختلاف کی بناء پر یکجا رہنا ناممکن ہوجاتا ہے۔ اسی قسم کی وہ وجوہات بھی ہوسکتی ہیں جن کے ساتھ سمجھوتہ کرنے کے بجائے اُن سے دُوری اور کنارہ کشی اختیار کرنا ہی بہتر ہوتا ہے۔ اور اسی بناء پر ازدواجی زندگی میں طلاق کے اختیارات موجود ہیں۔

جب دو شخصیتوں کا یکجا رہنا ناممکن ہوجائے تو انھیں الگ ہونے کا حق ہے۔ لیکن اس حالت میں بھی کسی فریق کی حق تلفی نہیں ہونی چاہیئے۔ اور یہ اس وقت ممکن ہے جب علیحدگی کا خیال، ارادہ اور عمل۔ عقل وفہم کے تحت ہو۔ غصہ۔ انتقام۔ بدلہ۔ بغض وحسد کے تحت گھر کو تباہ نہ کیا جائے۔ کیونکہ جب یہ حالت انسان پر طاری ہوتی ہے تو وہ اس وقت نہ اپنے حقوق کا جائزہ لیتا ہے اور نہ اپنے فرائض پر نگاہ ڈالتا ہے۔ چنانچہ ان عائلی قوانین میں طلاق کو عملی جامہ پہنانے کا وہ طریق کار اختیار کیا گیا ہے جو قرآن میں بیان کیا گیا ہے۔ یعنی غصہ کی حالت نہ ہو۔ رنج اور انتقام نہ ہو۔ اور ثالث اس صورت میں ہر دو فریق کی علیحدگی کو حسن کارانہ طریقہ پر انجام دینے کی کوشش کرے۔ ثالث بھی ایسا ہو جو دونوں فریق میں صلح کرانے کی جانب رجوع کرے۔ اور جب یہ ممکن نہ ہو تو پھر طلاق اس طریقہ سے تکمیل پائے کہ عورت کو اپنا حق مل جائے اور بچّوں کے حقوق اور تربیت کا بھی انتظام ہوجائے۔ اس کی مدت کو بھی لمبا کیا ہے کہ بہتر اور اچھی صورت پیدا ہوسکے۔ مثلاً طلاق تین ماہ بعد یا بصورت حمل، بعد پیدائشِ بچّہ کے عمل میں آئے۔

ان اصول اور قوانین کے مرتب کرنے میں یہ مقصد نہیں کہ کچھ حقوق مَرد سے لیکر عورت کو دیدیئے جائیں، یا اس کی آزادی کو ختم کردیا جائے۔ بلکہ مقصد ظلم اور زیادتی کو ختم کرنا، اور حق کا قائم کرنا ہے، تاکہ فریقین کے دلوں سے بے اعتمادی کو دُور کردیا جائے اور آنے والی نسل کی صحیح اور بہتر پرورش ہو سکے۔

آنے والی نسل کی پیدائش، پرورش اور تربیت کا کام ایسا آسان اور سیدھا سادہ نہیں کہ ایک کمسن لڑکی بغیر تربیت اور تعلیم کے انجام دے سکے۔ یہ تو صرف حیوانی سطح کا تقاضا ہے کہ ایک ۱۴ سال کی لڑکی بلا تعلیم وتربیت ازدواجی زندگی کے فرائض کو پُورا کرسکے۔ پیدائش کے ساتھ پرورش اور تربیت کا کام شروع ہوجاتا ہے۔ جس کے لئے مناسب عمر اور تعلیم کی ضرورت ہے۔ جہاں تک تعلیم کا تعلق ہے، ہمارے مُلک میں شاید آٹے میں نمک کے برابر بھی نہیں۔ بہر حال پاکستان بننے کے بعد اس کی ضرورت کا احساس اور صحیح راہ پر قدم اٹھالینا بھی ایک بڑی امید افزا تحریک ہے۔ کیونکہ پاکستان کا مقصد اسلامی معاشرہ کی تشکیل اور اس کا قیام ہے۔ چنانچہ ان قوانین میں یہ بھی واضح کردیا گیا ہے کہ شادی کے وقت لڑکی کی کم سے کم عمر ۱۴ سال کے بجائے ۱۶ سال ہونی چاہیئے۔

عائلی اصول وقوانین میں اس بات پر زور دیا جانا چاہیئے کہ انسانی بچّہ کی پرورش اور تحفظ کا پُورا پُورا انتظام کیا جائے۔ اس

کے تحت شادی کا معاہدہ خاندانی زندگی کا قیام اور طلاق کا طریق، یہ سب وہ امور ہیں، جن سے ہر ایک کے حق کی حفاظت ہو۔ پھر بھلا یہ کیسے قبول کیا جا سکتا ہے کہ ایسے بچے، جن کے والد کا انتقال ہو چکا ہو اور ان کو جو حقوق اپنے دادا سے ملسکتے ہوں، اُن سے محروم کر دیا جائے، اور اس پر ظلم یہ کہ اس طریق کو قرآن کی تعلیم سے منسلک کر دیا جائے۔ یہ کس قدر قابلِ تحسین و تشکر ہے کہ عائلی کمیشن نے اس نقصان دہ دستور کو ختم کر کے یتیم پوتے کو اپنے دادا سے اس کا حق دلوا دیا ہے۔

ان قوانین کے نفاذ کے بعد اس چیز کی ضرورت ہے کہ عوام کی تعلیم و تربیت اس انداز سے کی جائے کہ وہ ان پر پُورا پورا عمل کریں۔ اور اس سے جو خوشگوار نتائج بر آمد ہوں ان کا جائزہ لیا جائے، اور اس کے بعد پھر جن ترمیموں کی ضرورت ہو، ان کو حالات کے مطابق ترتیب دیا جائے۔ یہ اسلامی معاشرہ کی ابتدا ہے۔ جس کو ہماری روشن ضمیری قرآن کے اوراق میں بخوبی دیکھ اور سمجھ رہی ہے۔ اس سے بجا طور پر یہ اُمّید کی جا سکتی ہے کہ ہمارا معاشرہ سکون، خوشحالی اور انسانیت ساز رجحانات کا گہوارہ بن جائے گا۔ اور رفتہ رفتہ ہم اُس منزل تک جا پہنچیں گے جسے ہمارے لئے ہمارے خدا نے مقرر کیا ہے۔

والسّلام۔

بقیہ "بچّوں کی تربیت و تعلیم کی اہمیّت" صفحہ ۱۰۱ سے آگے

ضبط کے ساتھ کیجائے تو وہ اس پابندی کی حقیقت سے آشنا ہو کر کبھی بھی اس کے خلاف نہ ہونگی۔

بچّوں کی تربیت عمر کے لحاظ سے ہوتی ہے۔ موجودہ زمانہ بڑا ہی دشوار گذار ہے، آزادی کی لہر ہر فرد میں ہے۔ والدین کی مشکلات بڑھتی جا رہی ہیں ہمارے بچے ذہنی طور پر اُس سطح سے بلند ہیں، جو ہماری تھی۔ زمانہ برق رفتاری سے آگے بڑھ رہا ہے، اگر ہم نے اسی برق رفتاری سے زمانہ کا ساتھ نہ دیا تو ہم پچھلے جائیں گے ہمیں اپنے بچّوں کی ذہنی ترقی اور نشو و نما میں ان کی نگرانی، رہنمائی اور مدد ہر حال میں کرنی ہے۔ ان کے مسائل کا حل بھی ہم ہی انھیں بتا سکتے ہیں۔ یاد رکھئے! ہمارا فرض صرف جسمانی پرورش کے ساتھ ختم نہیں ہوتا۔ ذہنی ارتقاء، پاکیزہ سیرت اور بلند اقدار کی حامل قوم ہی صرف عبدِ مؤمن کا مقام حاصل کر سکتی ہے اور وہی خلافتِ ارض کے قابل بنتی ہے۔ ہمارے لئے ضابطۂ حیات قرآنِ کریم ہے اور مبارک ہیں وہ مائیں جو قرآنِ کریم کی صداقت اور عظمت کو اپنے بچّوں کے قلوب میں جا گزیں کر دیں اور ان کے بچے علیٰ وجہ البصیرت پکار اٹھیں کہ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ۔ اور پھر اُن کے یقینِ محکم اور عملِ پیہم سے صحنِ عالم جگمگا اُٹھے اور یہ فرمانِ باری تعالیٰ پُورا ہو جائے کہ

وَاَشْرَقَتِ الْاَرْضُ بِنُوْرِ رَبِّهَا

بقیہ "ڈاکٹر کی مشکلات" صفحہ ۳۸ سے آگے

معاشرہ کے سر ہو۔ نہ بیماروں کو اپنے علاج کے لئے کچھ دینا پڑے، نہ ڈاکٹروں کو اپنی ضروریات کے لئے اُن سے کچھ لینا پڑے۔ (اسی کا نام قرآنی نظامِ ربوبیت ہے)۔

یہ ہے، میری عزیز بہنو، بھائیو اور بزرگو، میرے خیال میں ان مشکلات کا حل۔ شاید آپ بھی اس سے متفق ہوں۔

والسّلام۔

اتحاد پریس بل روڈ۔ لاہور

with sex alone. All other attributes are denied her. The fact that a man cannot talk to a woman as he does to another man is the result of this attitude. Indeed ! there could be no deeper humiliation than to be made to personify something that has already been stigmatised and condemned. I am convinced that as long as sex is considered dirty and sinful, a woman will never be respected. Man has shown respect only to those women with whom he cannot have sexual relationship. These women are his mother, his sister and his daughters.

These are the hard and unpleasant facts that we must face. There is no escape from them. A woman is born a woman, and she has to die a woman. Birth is the determining factor. A Shudra might one day be born a Brahman even after 34 crores of births and rebirths. But "all the king's horses and all the king's men" cannot change a woman into a man.

Here is a challenge of the "woman's Question? This challeuge can be met by the Quran alone. It is only the Quranic social order that guarantees the fulfillment of the basic needs of every individual. It leaves no scope for one man to dominate another simply because he is in a position to fling to him a morsel of food. Each individual gets his requirements as a matter of right and not on the chance emotional bouts of charity and favour of a philanthropist. The future of the woman therefore lies in the Quranic Nizam-i-Rabubiat, for t[illegible] be secure is to be free.

Further more, the Quran breaks down one by one the citadels of man made religion by proclaiming to the world that there is absolutely no different between a man and a woman with the exception of the different biological function of reproduction. It is ridiculous to allocate exclusive characteristics to men and women on the basis of this biological difference. There are no such things as masculine tastes and feminine tastes, masculine habits and feminie habits, masculine interests and feminine interests, masculine talents and feminine talents, ete. ete.

And above all, the Quran has wrought a fundamental revolution in the attitude of mind towords sex. All the taboos and stigmas have been ripped of it and it is reinstated to its proper status. The woman is no longer an object for the gratification of man's lust but complementary to him.

Such are the Quranic values. Considering what the woman has lundergone in the past, and is undergoing today, she has an extra responsibility for her own sake to leave no stone unturned to establish the Quranic social order, for in this social order lies her hope and and her future.

was a easily obtained. The custodians of the man-made religious, declared that obedience to the king's will is obedience to God, and that woman, being the cause of Adam's banishment from paradise, is the source of all evil. The question of reforming and inproving her does not arise, because being born of Adam's ribs she will break if attempt is made to straighten her. The woman's bondage thus received a religious sanction. The idea of her being inferior became sacred, and as such it could not be touched. Furthermore, this sacrosanct character made its way into secular literature, where in the form of idioms and proverbs, it gained ground in the minds of the people. Without any hesitation and any qualms we today talk about educated women being "intellectual monstrosities, of her being "sweatly unreasonable", and we believe that "women should never be trusted", for "Frailty-thy name is woman".

The impact of this centuries old experience and development has convincd woman herself that she is inferior to man. Indeed, it is this conviction of hers that constitutes the biggest hurdle in her emancipation.

Ladies and gentlemen–bear patiently with me, for the end is not yet! Even if we do manage to secure economic security for the woman and prove to the people rationally that she is not inferior to man, it will not completly solve the "Woman's Question," for after all said and done, she is still a woman.

Unfortunately, in the course of the development of its culture and civilisation, mankind evolved unhealthy and unnatural notions about sex. The origin of this development can be traced to the ancient times, when the realisation that God has no parents and no children, that He was neither begotten nor does He beget, led the people erroniously to the conclusion that perfection and goodness is devoid of sex. This idea reached its culminating point in Christianity. The theory of Immaculate Conception, the virgin birth of Jesus, and the unmarried life that Jesus led, all proclaim the sinfulness and evil of sex. And then—wasn'it Eve who at the instigation of Satan tempted Adam to partake of the forbidden fruit so that they could achieve immortality through there offsprings? Consequently, every child is born with the original sin, and faith in the "purity" of Jesus alone can wash it away, and the ideal man is he who can escape the woman—the temptress.

One by-product of this attitude is that the woman has came to be associated

From the obove we deduce that one factor in the subjugation of women is economic dependence on man. This factor becomes clear and understandable when we analyse the background of the two types of tribal organisations-matriarchal and patriarchal. There have been instances when a really healthy woman did not feel the necessity of confinement. Before and after the birth of her child, she continued to work along with the menfolk. Secondlly, in some areas of the world, struggle for existance has been comparatively easier, so much so, that women have been able to share equally with men their economic pursuits. These places have witnessed the birth of matriarchal societies. But the places where these factors have been non-existent, emerged the patriarchal form of society. Of course, the patriarchal societies have been found in a majority, but the very fact that a few matriachal tribes did exist, proves beyond doubt that once the economic dependence is removed, woman has a better chance of realising her womanhood, and she can live as she ought to live. This is true not only of relationship between men and women, but also between men and men. Those who have monopoly over wealth, be they feudal lords, or capitalists or big business, have invariably exploited those who depend on them economically. The feudal lord exploits the toiling farmers, the capitalist his famished workers, the master in the house dominates the domestic servant, the boss bullies his immediate subordinate, the wealthy nations crush and repress the backward and poor nations, and-man subjugates the woman. The kings too found in this economic factor a masterplan to maintain their kingship. All that they had to do was to reduce the common man to poverty, and thus make him busy in eking out his living.

It is interesting to note here that in this economic struggle and the emergence of the rich and poor classes, women become in the economic terminology, a class by themselves.

However, the story does not end there. Having once enjoyed power to command and domineer, neither the ruller of the ruled, nor man, the master of the woman, cares to give it up. If only the position of the patriarch, the king and the man, gained through economice control, be justified, they could rule for ever. The justification

ضمیمہ طلوع اسلام

Causes of Woman's Subjugation

Prof. MISS SHAMIM ANWAR, (Kanaired College, Lahore)

[*Speech delivered at Tolu-e-Islam Convention on 8-4-1951*]

This afternoon, Ladies and gentlemen, I shall place before you some very practical prepositions regarding this eternal, (what I choose to describe as the) "Woman's Question." The subjugation of women has been the theme of many a book, and the fact that women even today are merely a dim travesty of what they might be, is now universally recognised. What provokes my curiosity is as to when, how and why women became subjugated. What are those factors that have created and perpetuated a margin between the potential development of her personality and individuality and her actual animal existence? Why has the woman not been able to cross this margin? This is the question that has always worried me. What ever I have learnt and discovered so far, I shall attempt to present before this august assemblage most humbly, but frankly and uninhibittedly.

Woman, by virtue of being the female sex, has been bestowed upon by Nature an important biological function-namely, the perpetuation of the human race. In this role she inevitably becomes incapacitated for a considerable period of time. This incapacity means that she has to depend upon someone for her self-preservation, someone who is never incapacitated and disabled as she is. This someone, in the Nature's scheme af things is the man. It is to this man that the woman has to look up to for her daily bread, a garment to cover herself, and a roof on her head. To be dependent in this manner is to be absolutely helpless, to be helpless is to he exploited. For sheer-self preservation and above all, the preservation of her children, the woman suffered it all, until this relationship of dependence and dominance became a universal and a rigid pattern. In the course of time this pattern came to be looked upon as a very "normal", and "natural" one, for man seems to be so constituted that if anything is practised by the majority and practised for a long time, it is regarded as the right thing, and any opposition to it is "abnormal", "unnatural" and of course "wrong".

ضمیمہ طلوع اسلام

Causes of Woman's Subjugation

Prof. MISS SHAMIM ANWAR, (Kanaired College, Lahore)

[Speech delivered at Tolu-e-Islam Convention on 8-4-1951]

This afternoon, Ladies and gentlemen, I shall place before you some very practical prepositions regarding this eternal, (what I choose to describe as the) "Woman's Question." The subjugation of women has been the theme of many a book, and the fact that women even today are merely a dim travesty of what they might be, is now universally recognised. What provokes my curiosity is as to when, how and why women became subjugated. What are those factors that have created and perpetuated a margin between the potential development of her personality and individuality and her actual animal existence? Why has the woman not been able to cross this margin? This is the question that has always worried me. What ever I have learnt and discovered so far, I shall attempt to present before this august assemblage most humbly, but frankly and uninhibittedly.

Woman, by virtue of being the female sex, has been bestowed upon by Nature an important biological function-namely, the perpetuation of the human race. In this role she inevitably becomes incapacitated for a considerable period of time. This incapacity means that she has to depend upon someone for her self-preservation, someone who is never incapacitated and disabled as she is. This someone, in the Nature's scheme af things is the man. It is to this man that the woman has to look up to for her daily bread, a garment to cover herself, and a roof on her head. To be dependent in this manner is to be absolutely helpless, to be helpless is to he exploited. For sheer-self preservation and above all, the preservation of her children, the woman suffered it all, until this relationship of dependence and dominance became a universal and a rigid pattern. In the course of time this pattern came to be looked upon as a very "normal", and "natural" one, for man seems to be so constituted that if anything is practised by the majority and practised for a long time, it is regarded as the right thing, and any opposition to it is "abnormal", "unnatural" and of course "wrong".